اردو شاعری

BAUL-202

(دوسرا پرچہ) برائے بی–اے سال دوم

Block- 1 to 3 (بلاک ۱ تا ۳)

Unit- 1 to 9 (اکائی ۱ تا ۹)

SCHOOL OF LANGUAGES
UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY, HALDWANI
(NAINITAL) -263139

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی ' ہلدوانی (نینی تال)

سرپرست اعلیٰ:

پروفیسر سبھاش دھولیا، وائس چانسلر، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی

کمیٹی بورڈ آف اسٹڈیز:

پروفیسر ایچ۔ پی شکلا (ڈائرکٹر، اسکول آف لینگویجز UOU)
پروفیسر سید محمد ہاشم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
پروفیسر سید محمد نعمان، این۔سی۔ای۔آر۔ٹی، دہلی۔
ڈاکٹر اختر علی، اکیڈمک ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر گرجا پانڈے، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈینیٹر وایڈیٹر:

ڈاکٹر اختر علی

اکیڈمک ایسوسی ایٹ، شعبہ اردو، اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

c جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت: جولائی 2013

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی کے درس نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات یا کسی بھی وضاحت کے لیے یونیورسٹی حکام یا کورس کوآرڈینیٹر سے یونیورسٹی کے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

Course Coordinator (urdu)

Uttarakhand Open University,Haldwani-263139(Nainital)

Phone: 05946-261122, 261123 Tool free No. 1800 180 4025

Fax: 05946-264232, E-mail: info@ uou.ac.in,http://uou.ac.in

پیش لفظ

اتراکھنڈاوپن یونیورسٹی کا قیام اتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت 31 اکتوبر 2005 کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ذریعے ان لوگوں تک تعلیم کو پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب ازخود کالجوں اور یونیورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی جن تعلیمی پروگراموں کی شروعات کی ہے ان میں سے ایک بیچلر آف آرٹ بھی شامل ہے۔ ''اردو ادب'' اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ یہ کتاب بی ۔اے سال دوم (دوسرا پرچہ) کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ تین بلاکوں اور نو اکائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ اکائیاں دراصل الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقہ تعلیم کی کتابوں کو خود تدریسی مواد [Self Instructional Material(SIM)] کہا جاتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ طالب علم کو اس مواد کو خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اسے پڑھانے کے لیے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا۔ آپ اس مواد کو خود ہی پڑھیں گے اور خود ہی سمجھیں گے۔ اس صورتحال کے تحت اسباق کو اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجود ہونے کا احساس ہو سکے اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی بہت حد تک دور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مربوط و مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان میں ''اپنے مطالعے کی جانچ کے سوالات'' بھی دیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ بھی پڑھا ہے اسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے' اس کا اندازہ لگا سکیں۔ ان سوالات کے جوابات آخر میں دیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود ہی جواب دیں اور جب جواب مکمل ہو جائے تب آخر میں دیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملا لیں۔ اس سے آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگا اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہوگی۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اس کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ اکائیوں کے آخری حصے میں بعض کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ آپ ان کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

ہم آپ کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

فہرست

بلاک نمبر۱۔غزل

اکائی ۱۔اصغرؔ گونڈوی	ڈاکٹر پرویز احمد
اکائی ۲۔یگانہؔ چنگیزی	ڈاکٹر اختر علی
اکائی ۳۔شادؔ عظیم آبادی	ڈاکٹر پرویز احمد

بلاک نمبر۲۔غزل

اکائی ۴۔خواجہ حیدر علی آتشؔ	ڈاکٹر ریشمہ پروین
اکائی ۵۔مومن خاں مومنؔ	ڈاکٹر مشتاق صدف
اکائی ۶۔اسداللہ خاں غالبؔ	ڈاکٹر مشتاق صدف

بلاک نمبر۳۔نظم

اکائی ۷۔ساحرؔ لدھیانوی۔'خون پھر خون ہے'	ڈاکٹر نغمہ پروین
اکائی ۸۔مخدومؔ محی الدین۔'چارہ گر'	ڈاکٹر عرشیہ جبیں
اکائی ۹۔کیفیؔ اعظمی۔'مکان'	پروفیسر علی احمد فاطمی

بلاک نمبر 1

اکائی 1. اصغر گونڈوی

اکائی 2. یگانہ چنگیزی

اکائی 3. شاد عظیم آبادی

یہ بلاک اُردو کے تین اہم غزل گو شعرا اصغر گونڈوی، یگانہ چنگیزی اور شاد عظیم آبادی کی حیات و خدمات پر مشتمل ہے جنہوں نے اُردو شاعری اور خاص طور پر اُردو غزل کو وقار بخشا۔ یہ تینوں ایک ہی عہد کے شاعر ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاعری میں ہر طرف معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ شعرا اپنے فن کو سنوارنے اور کچھ الگ کر دکھانے کی خاطر اپنا خونِ جگر صرف کر رہے تھے۔ ہر کوئی اپنے یہاں کوئی نئی بات، نیا انداز، نئی ادا پیدا کرنے کی کوشش میں تھا۔ نتیجتاً شاعری میں بہت نکھار آیا اور یہ فنی سطح پر کافی بلند ہوئی۔

اصغر گونڈوی کا نام جدید غزل کے معماروں کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ یگانہ گرچہ پٹنہ میں پیدا ہوئے لیکن مستقل سکونت لکھنؤ میں اختیار کی اور وہیں کے رنگ میں شاعری کی۔ شاد عظیم آبادی کا شمار اُردو کے کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ آیئے ہم ان تین اہم غزل گو شعرا کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں!

اکائی 1: اصغر گونڈوی

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 اصغر حسین اصغر گونڈوی: حیات

1.4 اصغر گونڈوی کی شاعرانہ خصوصیات

1.4.1 فلسفۂ حسن وعشق 1.4.2 بلند نظری

1.4.3 اسرار ومعارف 1.4.4 ندرت بیان

1.5 اصغر گونڈوی کی غزل (1)

1.5.1 مجموعی تاثر

1.5.2 تشریح

1.6 اصغر گونڈوی کی غزل (2)

1.6.1 مجموعی تاثر

1.6.2 تشریح

1.7 خلاصہ 1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 معاون کتابیں

1.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اصغر گونڈوی کی حیات' شاعری اور غزل گوئی کی تمام خصوصیات پر گفتگو کی جائے گی۔ طلبہ کے خصوصی مطالعے کے لیے دو غزلیں بھی شامل ہیں۔ ان غزلوں کے مجموعی تاثر کے ساتھ ساتھ ہر شعر کے الگ الگ تشریح بھی کی جائے گی اس کے علاوہ اشعار کے شعری محاسن پر بھی ہماری نگاہ ہوگی جن کا ذکر اشعار کی تشریح کے ساتھ ہی کر دیا جائے گا۔ اکائی کے اختتام پر اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کائی کے پڑھنے کے بعد آپ اصغر کی شخصیت اور شاعری سے پوری طرح واقف ہوسکیں گے۔

1.2 تمہید

اصغر گونڈوی کا شمار جدید غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اردو غزل پر بیسویں صدی کے اوائل میں جب بپتا پڑی اور اسے گردن زدنی قرار دیا گیا تو اس میں ایک نئی جان پھونکنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں جن لوگوں نے نمایاں کردار ادا کیا ان میں اصغر کا نام سرفہرست ہے۔ اصغر کے علاوہ اس کام میں حسرت موہانی' اقبال سہیل' فانی بدایونی اور جگر مرادآبادی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان لوگوں نے جدید غزل کو وقت کے ساتھ چلنے کا ہنر بخشا۔ اصغر کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی اخلاق کی بلندی ہے۔ ان کی شاعری نے اور کوئی کام کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ہم کو شریف انسان بنانے کی جو کوشش ان کے یہاں ملتی ہے کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی

1.3 اصغر حسین اصغر گونڈوی: حیات

اصغر گونڈوی یکم مارچ 1884ء کو گورکھپور کے محلے الہیٰ باغ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام اصغر حسین تھا۔ ان کے والد مولوی تفضّل حسین قانون گو تھے۔ لہٰذا جب ان کا تبادلہ گورکھپور سے گونڈہ ہوا تو ان کے اہل خانہ بھی ان کے ساتھ گونڈہ چلے آئے۔ اصغر کی ابتدائی تعلیم گونڈہ ہی میں ہوئی۔ انہوں نے 1898ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور یہیں سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اصغر نے اپنی تعلیم کسی طرح انٹرنس تک جاری رکھی مگر اس کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس کے باوجود انہوں نے ذاتی مطالعے کی بنا پر اچھی خاصی قابلیت پیدا کر لی تھی۔

اصغر نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھایا۔ بعد میں کچھ دنوں منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی مشورۂ سخن لیتے رہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی استادی و شاگردی بس ایک رسم کی ادائیگی ہوتی ہے کیونکہ شاعر کا اصل رہبر اس کا ذوق صحیح، وجدان اور طبیعت کی موزونی ہوتا ہے جو اسے دھیرے دھیرے صحیح راستے پر ڈال دیتا ہے۔

ریلوے کے محکمے میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا تو بیس روپے ماہوار تنخواہ پانے لگے۔ اس کے بعد کے چند برس ان کی زندگی کا ایسا دور تھا جو ان کی شخصیت سے کہیں سے بھی میل نہیں کھاتا یعنی یہ وقت ان کی مے نوشی کا تھا۔ ''چھٹن'' سے اصغر گونڈوی کو قربت ہوئی اور انہوں نے ان سے نکاح کر لیا۔ آہستہ آہستہ اصغر کا مذہبی رجحان بڑھتا گیا اور بہت جلد ہی انہوں نے اپنی پرانی روش ترک کر دی۔ عبادت اور تصوف کی طرف ان کا ذہن مائل ہو چکا تھا۔ اس تبدیلی نے آخر ایک دن انہیں عبدالغنی منگلوری سے شرف بیعت حاصل کروا دیا۔ 1913ء میں جب سے انہوں نے بیعت کا شرف حاصل کیا تھا اس کے بعد سے تصوف اور علم و عرفان ان کی توجہ کے مرکز بن گئے۔ اسی سال دوکان کر لی اور مستقل طور سے اس پر بیٹھنے لگے۔ چونکہ طبیعت کچھ ایسی تھی کہ تجارت راس نہیں آئی اور گھاٹا برداشت کرنا پڑا۔ 1916ء میں جگر مرادآبادی سے ملاقات ہوئی۔ یہی ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ جگر اصغر کے دلدادہ ہو گئے۔ اصغر کی زندگی میں وہ دور بھی آیا جب وہ چشمے کے کاروبار کے سلسلے میں جگر کے معاون ہو گئے۔ اس سے قبل وہ ''قصرِ ہند'' ہفتہ وار (1913) کے مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ جس کا نام بعد میں بدل کر ''پیغام'' کر دیا گیا تھا۔ 1926ء میں وہ عطر چند کپور کے ''ادبی مرکز'' سے وابستہ ہو گئے۔ جب ادارے کا کاروبار دم توڑنے لگا تو اصغر گونڈہ چلے آئے۔ 1930ء میں سر تیج بہادر سپرو نے ایک اکادمی ''ہندوستانی اکیڈمی'' کے نام سے قائم کی تو اصغر اس میں کام کرنے لگے۔

اصغر مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ سامعین کے سامنے کلام پیش کرنے کے لیے ان کی آواز موزوں نہیں تھی۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''نشاطِ روح'' دسمبر 1925ء میں اور دوسرا مجموعہ ''سرودِ

زندگی'' 1935ء شائع ہوا۔ اصغر نہایت کم گو تھے۔ اتنا کم کہنے کے باوجود اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں ایسی قابل قدر خوبیاں موجود ہیں۔ جو ایک معیاری شاعری کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان کے پورے کلام میں انبساط اور سرمستی کی ایک وجدانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بغیر آہ و فریاد کیے اصغر عشق کی منزلیں بآسانی طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً

نشۂ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے
کون ذرہ ہے کہ سرشار محبت میں نہیں

❁❁

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی

اصغر گونڈوی کے منفرد رنگ و آہنگ کی ابتدا ''نشاطِ روح'' سے ہوتی ہے۔ وہ فرسودہ مضامین باندھنے سے گریز کرتے ہیں۔ زبان و بیان اور خیالات دونوں اعتبار سے ان کا کلام بھی ابتذال کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتا۔ ان کے لب و لہجے میں ایک متانت آمیز رنگینی اور خیالات و محسوسات میں پاکیزگی و لطافت پائی جاتی ہے۔ تصوف اور معرفت کے مضامین کو کیف و سرور کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی تخلیق کچھ یوں ہوتی ہے کہ دل پر اثر کرتی ہے۔ اردو ادب کا یہ مایہ ناز ادیب 1936ء میں الٰہ آباد میں روپوش ہوا اور وہیں پر تدفین عمل میں آئی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. اصغر گونڈوی کا اصل نام کیا تھا؟
2. اصغر کہاں پیدا ہوئے؟
3. اصغر نے سب سے پہلے کون سی ملازمت حاصل کی تھی؟
4. اصغر نے کس بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی؟

1.4 اصغر گونڈوی کی شاعرانہ خصوصیات

شاعر ہو یا نثر نگار۔ سب کا اپنا ایک مزاج' حیثیت اور امتیازی وصف ہوتا ہے۔ جس سے اس ادیب کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مجاز کا اپنا رنگ ہے' فانی کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور فیض احمد فیض کا اپنا ایک لہجہ ہے۔ لیکن ان سب کی پہچان سب سے پہلے شاعر کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ سبھی اپنا اپنا منفرد لب و لہجہ رکھتے ہیں اور اسی سے ان کی شناخت اور شخصیت قائم ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اصغر کا بھی ایک مخصوص رنگ ہے۔ جس سے ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ غزلیات اصغر کی سب سے بڑی خصوصیت اخلاق کے معیار کی بلندی ہے۔ ان کے کلام میں تلاش کرنے کے بعد بھی ایسا ایک شعر نہیں مل سکتا۔ جو معیار سے فروتر ہو۔ حسن و عشق' وصل و ہجر' سوز و گداز' حسرت و یاس' جوش و وارفتگی اور مسرت و انبساط۔ غرض یہ کہ تمام طرح کے مضامین باندھے گئے ہیں لیکن کہیں بھی ابتذال یا عامیانہ پن کا نام نہیں ہے۔ اصغر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

> ''خدا کا شکر ہے کہ جناب اصغر کی شاعری عام سطح سے بہت بلند ہے اور ان کے یہاں ڈوبی ہوئی نبضیں' پتھرائی ہوئی آنکھیں اور عالم نزع کی ہچکیاں غرض یہ کہ زندہ درگور شعرا کی بدمذاقیاں کہیں بھی نہیں ہیں۔ ان کی شاعری رقصِ معانی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔'' (نشاط روح)

غزل کو بیسویں صدی ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرانے میں اصغر سب سے پیش پیش تھے۔ سامنے کی باتیں ہوں یا عام وارداتِ قلبی ہوں۔ ان سب کو اصغر ایک نئے پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ جس سے کلام میں ایک ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی پوری شاعری میں نشاط و سرمستی کی ایک وجدانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس کے باعث وہ عشق کی منزلیں بغیر آہ و فغاں کے طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

غزل کیا اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغر
یہاں افسوسِ گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

شعر میں رنگینیِ جوشِ تخیل چاہیے　　مجکو اصغر کم ہے عادت نالۂ و فریاد کی

❁❁

ہے خستگیِ دم سے رعنائیِ تخیل　　میری بہار رنگیں پروردۂ خزاں ہے

❁❁

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا　　روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

جوشِ شباب و نشہ صہبا ' ہجوم شوق　　تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصل بہار کو

یہ لب ولہجہ اور خزاں کا پروردہ رنگین مزاج اصغر ہی کے بس کی بات تھی۔ بیسویں صدی میں غزل کو نئی بلندیوں اور نئی منزلوں سے روشناس کرانے والوں میں فانی' جگر اور حسرت بھی اصغر کے ہم قدم تھے لیکن یہ جوش وجذبہ اصغر ہی سے منسوب ہے۔ ہر ایک کا اپنا رنگ ہے اور یہ سبھی اپنے اسی منفرد رنگ وآہنگ سے پہچانے جاتے ہیں۔

اصغر نے غالب اور اقبال دونوں سے ہی فیض حاصل کیا ہے لیکن یہ فیض کورانہ تقلید نہیں ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کے اختیار کرنے کو اگر دیکھیں تو یقیناً غالب کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً دل شعلہ آرزو' درماندگی ذوق تماشا' ہجوم دردِ غریبی' کاوشِ بے مدعا' نور بہار ناز اور ہر بن مو سے ٹپکتا ہے وغیرہ وغیرہ اس طرح کی تراکیب ہیں جنہیں اصغر نے غالب سے لیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات صبر واستغنا' عمل پیہم' سخت کوشی' ناز ونیاز کا امتزاج اور فلسفۂ وحدت الوجود ہیں۔ ان موضوعات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال سے بھی وہ کافی متاثر تھے۔ لیکن جدید اردو شاعری میں ان کا ایک منفرد مقام ہے۔ ان کے کلام میں فکری' فنی اور ادبی محاسن کا ایک خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ آیئے اب اصغر کی شاعرانہ خصوصیات پر گفتگو کی جائے۔

1.4.1 فلسفۂ حسن وعشق

اردو شاعری بالخصوص غزل میں حسن وعشق کے مضامین بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے بغیر غزل کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ حسن وعشق کے فلسفے کے متعلق لوگوں کی رائیں الگ الگ ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک حسن بذات خود کوئی چیز نہیں۔ اس میں ہمارے ذوق کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی عشق ہی حسن کا خالق ہے۔ دوسرے

نظریے کے لوگوں کا ماننا اس سے مختلف ہے یعنی حسن ایک حقیقت ہے اور یہ عشق کا محرک اور خالق ہے۔ حسن و عشق کے فلسفے سے متعلق تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حسن اور عشق دونوں اپنی جگہ پر مستقل وجود کے حامل ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کی طرف لگاؤ ایک فطری عمل ہے۔ چوتھا نظریہ یہ ہے کہ تمام کائنات ایک حسنِ ازل کا پرتو ہے لہذا حسن و عشق کی حقیقت ایک ہے۔ مذکورہ تمام طرح کے اشعار کی مثالیں اصغر کے کلام سے درج کی جاتی ہیں:

پہلا نظریہ:

میرے مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

❁ ❁

اس میں وہی ہیں یا مرا حسن خیال ہے
دیکھوں اٹھا کے پردۂ ایوانِ آرزو

❁ ❁

تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی
پردۂ محمل اٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

❁ ❁

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

❁ ❁

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں
سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

دوسرا نظریہ :

اک غنچۂ افسردہ یہ دل کی حقیقت تھی
یہ موجزنی خوں کی رنگینی پیکاں ہے
پھر گرم نوازش ہے ضو مہر درخشاں کی
پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے

❁ ❁

کیا فیض بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی
ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

تیسرا نظریہ :

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا
اس رخ پہ دیکھتا ہوں اپنی نظر کو میں

❁ ❁

مجنوں کی نظر میں بھی شاید کوئی لیلیٰ ہے ایک ایک بگولے کو دیوانہ بنا آئی

❁ ❁

مستی سے ترا جلوہ خود عرض تماشا ہے آشفتہ نگاہوں کا یہ کیف نظر دیکھا

چوتھا نظریہ :یہ وہ نظریہ ہے جسے سلوک کی اصطلاح میں وحدت الوجود کہتے ہیں۔وحدت الوجود کے فلسفے کو تمام با کمال شعرانے اپنے اپنے انداز میں نظم کیا ہے۔اصغر نے اس مضمون کو اپنے طور پر بخوبی ادا کیا ہے۔ملاحظہ ہو۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

❁ ❁

کچھ غنیمت ہوگئی یہ پردہ ہائے آب و رنگ حسن کو یوں کون رہ سکتا تھا عریاں دیکھ کر

❁ ❁

بند ہو آنکھ اٹھے منظر فطرت کا حجاب لاؤ اک شاہد مستور کو عریاں کریں

❁ ❁

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ و آشکار صدہا حجاب صورت معنی لیے ہوئے

1.4.2 بلند نظری

شاعر جب اپنے کلام میں عالی حوصلہ،اعلیٰ خیال اور اپنے تخیل کی بدولت ایسے مضامین باندھتا ہے جو عمومی سطح سے بہت اوپر ہوں تو اسے بلند نظری سے موسوم کیا جاتا ہے۔اصغر کے کلام میں اس طرح کے مضامین کو بارہا نظم کیا گیا ہے۔مثلاً

یہ دین و وہ دنیا ہے، یہ کعبہ وہ بت خانہ ایک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ

❁ ❁

کیا درد ہجر اور یہ کیا لذت وصال اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

❁ ❁

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے نہ میں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

❁ ❁

اک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں　　کفار کا مٹ جانا خود مرگِ مسلماں ہے

❁ ❁

نہ ہوگا مستیِ بے مدعا کا رازداں برسوں　　وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

1.4.3 اسرار و معارف

اسرار سر کی جمع ہے جس کے معنی راز اور بھید ہیں۔ شاعری میں جب شاعر کائنات کے مضامین سے نکل کر الوہیت اور فلسفہ و حکمت کے مضامین باندھتا ہے تو اسے اسرار و معارف کے مضامین کہتے ہیں۔ یہ مرحلہ آسان نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہر شاعر کے لیے ممکن ہے۔ یہ ایک خاص طرح کے مزاج سے وابستہ لوگوں کے لیے ہی ممکن ہوسکتا ہے یعنی جس کی طبیعت میں خدا شناسی کے راز کو جاننے اور اس پر گفتگو کرنے کا شوق ہو وہ اس طرح کے مضامین نظم کرسکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر کا تخیل ہی پہنچ سکتا ہے۔ دراصل یہ مقام اصغر جیسے شاعر کے لیے شاعری کی معراج ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اقبال سہیل لکھتے ہیں:

> ''اگر ایک شاعر عالم رنگ و بو سے گذر کر فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ مذہب کے اسرار و رموز' اور مراحل سلوک و عرفاں کی کیفیات مجردہ اسی ترنم' اسی جدت بیان اور اسی حسن مصوری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کی شاعری سحر سے گزر کر اعجاز بن جاتی ہے۔ اس طرح کے شاعر کے لیے بصیرت' تاثر اور قوت بیان' تینوں کا اجتماع ضروری ہے۔ یعنی ایک طرف تو قوت مشاہدہ اتنی تیز ہونی چاہیے کہ نہایت دقیق نکتوں تک پہنچ سکے' دوسری جانب احساس اتنا لطیف ہونا چاہیے کہ وہ غیر مادی حقائق سے بھی لذت اندوز ہوسکتا ہو اور ان دونوں مراحل کے بعد قوت بیان ایسی ہونی چاہیے کہ عرفان و ذوق کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر ایک نئے انداز کے ساتھ شعر کے نغمۂ موزوں میں کھینچ کر دوسروں کو بھی لذت اندوز کر سکے تو وہ ایک باکمال شاعر ہے۔'' (نشاط روح' از اقبال سہیل' صفحہ 59)

درج بالا مضامین کو غزل کے سانچے میں ڈھالنا آسان نہیں۔ دوسرے ان مضامین کو اگر خشک طریقے سے باندھا جائے گا تب بھی وہ بات پیدا نہیں ہوگی۔ بقول غالب۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جیسی کہ بادۂ وساغر اور گل وبلبل کی زبان میں پیش کرنے سے پیدا ہوگی۔ اسی بات کو اوپر کے شعر میں غالب نے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اصغر نے اسرار و معارف کے لطیف سے لطیف مضامین میں بھی ایک نئی کیفیت اور طرز سے اشعار کہنے کی کوشش کی ہے۔

پھر آج جوش سر حقیقت ہے موجزن — کچھ پردہ ہائے ساغر و مینا لیے ہوئے
اب تک تمام فکر و نظر پر محیط ہے — شکل صفات معنی اشیا کہیں جسے

❁❁

تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا — کمال ہوش کہوں یا کمال بے خبری
نظارہ بھی اب گم ہے بے خود ہے تماشائی — اب کون کہے اس کو جلوہ نظر آتا ہے

اہل بصیرت علم وعرفان اسے کہتے ہیں کہ انسان کے تمام ادراکات واحساسات پر جمال دوست کا قبضہ ہو جائے۔ ذات وصفات کا فرق مٹ جائے تو اس مقام کو اصطلاح سلوک میں فنا کہتے ہیں۔

تھیں خود نمود حسن میں شانیں حجاب کی
مجھ کو خبر رہی نہ رخ بے نقاب کی

جس طرح کمالِ بے خبری ہی اصل علم وعرفان ہے اسی طرح کمال ظہور بھی عین حجاب ہے۔ اس حقیقت کی نہایت دلکش مصوری اس شعر میں کی گئی ہے۔ اس فلسفے سے متعلق اصغر کی ایک نظم ''سرفنا'' ہے۔ چند مثالیں اور پیش کی جارہی ہیں جن کا تعلق اسی سے ہے۔

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا — اے خوشا دردے کہ نزدیکی بھی ہے دوری بھی ہے

میں تو ان محجوبیوں پر بھی سراپا دید ہوں　　اس کے جلوہ کی ادا اک شان مستوری بھی ہے

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا　　قرب کی راہوں میں میری راہ اک دوری بھی ہے

1.4.4 ندرت بیان

ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعر بالکل نیا خیال پیش کرے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر وہی خیالات جو پہلے ادا کیے جا چکے ہیں، انھیں میں کچھ اضافہ کر کے ایک نیا پن لانے کی کوشش کرتا ہے یا ایک خیال کے ایک پہلو کو بدل کر دوسرا پہلو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر دو متضاد چیزوں میں مماثلت اور دو مماثل چیزوں میں تضاد پیش کرتا ہے۔ یہ کیفیتیں خیال آفرین کہی جا سکتی ہیں لیکن اگر کسی پرانے خیال کو اس کی جگہ قائم رکھ کر طرز ادا سے اس میں نئی روح شاعر نے پھونک دی ہے تو اس کو ندرت بیان کہتے ہیں۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ندرت بیان پرانی شراب کو نئے ساغر و مینا میں پیش کرنے کا نام ہے۔ بقول اصغر گونڈوی:

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

حقیقت میں یہی ندرت بیان شاعری کی روح ہے۔ نیا خیال ہر شعر میں پیش کرنا ناممکن سی بات ہے اور پرانے خیالات اور مضامین کو بغیر کسی نئے پن کے پیش کرنا بھی بے غیرتی ہے لہذا یہ بات طئے ہے کہ طرز ادا سے ہی شاعر اپنے مضامین میں نیا پن پیدا کرتا ہے۔ اصغر گونڈوی کی شاعری کا ایک مخصوص لہجہ ہے۔ ان کے اس رنگ کو بعد کے شعرا میں کوئی بھی اپنا نہ سکا۔ اصغر اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر ہیں۔ ندرت بیان کی مثالیں اصغر گونڈوی کے کلام سے درج کی جاتی ہیں:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

❁❁

کیا کیا ہوا ہنگامۂ جنوں یہ نہیں معلوم　　کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

❁❁

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب　　فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

❁❁

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں　　تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

❁❁

آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا　　کیا منھ دکھاؤں گا تری برق نظر کو میں

❁❁

جوش شباب ' نشۂ صہبا ہجوم شوق　　تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

❁❁

تو برق حسن اور تجلی سے یہ گریز　　میں خاک اور ذوق تماشا لیے ہوئے

اصغر گونڈوی کی شاعرانہ خصوصیات میں اب تک جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ان کی شاعری کی اصل پہچان ہیں۔اس کے علاوہ صفائی و برجستگی،لطافت خیال اور فلسفہ وحکمت پر بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔لیکن اس کا محل یہاں نہیں ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

5. فلسفۂ حسن وعشق سے متعلق پہلے نظریے سے ایک شعر نقل کیجیے۔
6. ندرت ادا کسے کہتے ہیں؟
7. اصغر کی شاعری سے ان کی بلند نظری کی ایک مثال پیش کیجیے۔

1.5 اصغر گونڈوی کی غزل (1)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا　　جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

میں کامیاب دید بھی ' محروم دید بھی　　جلووں کے ازدھام نے حیراں بنادیا

یوں مسکرائے ' جان سی کلیوں میں پڑ گئی　　یوں لب کشا ہوئے ' کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی　　کچھ قیدِ رسم نے جسے ایماں بنا دیا

وہ شورشیں ' نظام جہاں جن کے دم سے ہے　　جب مختصر کیا ' انہیں انسا ں بنادیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے ' نیشتر　　تم نے مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

1.5.1 مجموعی تاثر

یہ غزل اصغر کے دوسرے شعری مجموعے ''سرودِ زندگی'' سے اخذ کی گئی ہے۔ یہ غزل ان کی نمائندہ غزلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ حسن و عشق کے مضامین غزلوں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جس طرح اصغر مضمون کو باندھتے ہیں۔ ان سے ان کی معیار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ ساتھ ہی حسن و عشق کا مرتبہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ اصغر کو فلسفے سے خاص لگاؤ ہے اور اس کا اثر ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ غزل کل 10 اشعار پر مشتمل ہے جس میں سے اوپر نقل کیے گئے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ حسن و عشق سے متعلق معاملات میں عشق مجازی و حقیقی کی گفتگو اکثر کی جاتی ہے۔ اصغر کے اشعار میں یہ خوبی اکثر پائی جاتی ہے کہ ان پر مجازی اور حقیقی کا اطلاق بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اس غزل کی زبان آسان ہے۔ اس میں کوئی مشکل لفظ نہیں آیا ہے۔ مگر ان آسان لفظوں سے بڑی کامیابی کے ساتھ بڑے مضامین ادا کرنے میں شاعر نہایت کامیاب رہا ہے۔

1.5.2 تشریح

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دکھوں کو، روزگار کے مسائل کو حل کرنے کی ایک نئی ترکیب نکالی ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے جو بھی دکھ ہیں، جو بھی مصیبتیں ہیں، میں نے سبھی کو غم جاناں کی طرف سے سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ اس شعر میں دو ترکیبیں ہیں آلام روزگار اور غم جاناں، جس میں غم جاناں زیادہ توجہ کا طلب گار ہے۔ اس شعر کو مجازی و حقیقی دونوں ہی معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یعنی میری زندگی میں جو بھی دکھ ہیں، مصیبتیں، تکلیفیں، رنج و الم جو بھی ہیں انہیں میں یہ سمجھ کر قبول کیے لیتا ہوں کہ یہ سب قدرت کی طرف سے میرے نصیب میں ہیں۔ غم جاناں پر اگر غور کریں تو تصوف کی اصطلاح کے اعتبار سے، یہ ترکیب بارہا اپنے معشوق کے لیے صوفیائے کرام نے استعمال کی ہے۔ دوسرے مجازی معنی پر اگر غور کریں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میری زندگی میں جو بھی دکھ اور پریشانی ہے وہ اسی محبوب کی وجہ سے ہے۔ سو ہم نے غم جاناں کی طرف سے منسوب کردہ سمجھ لیا۔ یہاں غم جاناں پر ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے

چونکہ غم جاناں ایسا غم ہے جو جان کے ساتھ ہی ختم ہونے والا ہے۔ اردو غزل کا روایتی محبوب کبھی بھی عجز و نیاز سے عاشق کی بات تسلیم نہیں کرتا۔ سو اصغر کا کہنا ہے کہ ہم زندگی کے غم کو غم جاناں سمجھ کر اپنا لیا یہی میرے نزدیک بہتر تھا' زندگی کو آسان بنانے کے لیے۔

دوسرا شعر: عاشق اپنی حیرت کا اظہار کر رہا ہے کہ کہاں تو ایک جھلک پانے کے لالے تھے اور کہاں اس قدر جلوے۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسی عالم استعجاب میں کہہ رہا ہے کہ میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی۔ یعنی ایک جھلک یا ایک نظر دیکھنے کے بجائے جلووں کا انبوہ لگ گیا' جس سے عاشقی کی نگاہیں چوندھیا گئیں۔

اب شعر کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ میں نے دیدار کیا ہے۔ یہ سچائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں کے خیرہ ہو جانے کے باعث میں جی بھر کے دیکھنے سے محروم رہ گیا۔ وہ جو ملاقات سے پہلے ایک حسرت و یاس تھی وہ اب بھی اسی طرح برقرار رہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ توقع سے زیادہ جب انسان کو کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے اور وہی یہاں بھی ہوا ہے۔ کیونکہ عاشق جھلک کا طالب ہوتا ہے اور جب جھلک کے بجائے جلوؤں کا انبوہ' جلووں کی بھیڑ لگ گئی تو وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا یا یوں کہیں کہ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اس شعر کو پڑھنے سے سرسری نظر میں تلمیح کا خدشہ ہوتا ہے حالانکہ یہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں دیدار ہوا ہی نہیں تھا اس سے قبل ہی وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس لیے اس شعر میں کوہ طور کے واقعے سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ لہٰذا تلمیح کا شبہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں تشبیہ ہے' جس کے ذریعے شاعر اپنے محبوب کی تعریف کر رہا ہے۔ اپنے محبوب کی مسکراہٹ اور اس کی گفتگو کی تعریف جس خوبی سے اصغر نے کی ہے وہ انہیں کا وطیرہ ہے۔ اس نکتے کو وہی سمجھ سکتا ہے جو مسکراہٹ اور لب کشائی کے ساتھ ساتھ کلی کے کھلنے اور پھول کے فرق کو سمجھ سکتا ہو۔

تشبیہ کا اصل حسن اس بات پر ہوتا ہے کہ جس چیز کو جس چیز سے تشبیہ دی جائے یعنی شبہ کی تعریف' حسن و خوبی مشبہ بہ کے ذریعے بڑھ جائے' اس کی شان میں اضافہ ہو جائے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اس کے محبوب کی

مسکراہٹ اتنی لطیف ہے کہ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا کلی کھل رہی ہے۔ یعنی وہ اپنے نرم و نازک ہونٹوں کو ایک بہت ہی ہلکی سی جنبش دیتا ہے، جس کے لیے شاعر کہتا ہے کہ اس کی وہ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر ایسا لگا جیسے کہ کلیوں میں جان پڑ گئی ہو۔ ٹھیک اسی طرح اپنے محبوب کی لب کشائی یعنی گفتگو کرنے کی تعریف میں شاعر نے چند لفظوں میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ لب کشا ہونے سے مراد بات کرنا، گفتگو کرنا، لب کھولنا، منھ کھولنا ہو سکتا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ اس کی مسکراہٹ ایک تو ایسی ہے کہ کلیوں میں جان ڈال دے تو دوسری طرف اس کی شیریں گفتاری ایسی ہے کہ لگتا ہے جیسے گلستاں کھل اٹھا، یا موسم بہار آ گیا۔

اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے۔ لب کشا ہونے کا مطلب بات کرنا ہوتا ہے مگر یہاں جس طرح سے اصغر نے اسے استعمال کیا ہے اسے محبوب کی شیریں زبانی کے ساتھ ساتھ اس کی ہنسی کی طرف بھی ذہن جاتا ہے یعنی اس کی ہنسی ایسی دلفریب ہے کہ اس سے گلزار میں ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اپنے محبوب کی مسکراہٹ کو کلیوں میں جان ڈالنے اور لب کشائی یا منھ کھولنے کو گلستاں بنانے سے موسوم کرنے سے شاعر کے تخیل اور اس کی ندرت بیان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

چوتھا شعر: اس شعر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا مطالعہ کافی وسیع ہو اور اسی کے ساتھ اس کی نگاہ فلسفے پر بھی ہو۔ یہ شعر سرسری طور سے گزرتے ہوئے سمجھنے کا نہیں بلکہ ٹھہر کر غور کرنے کا ہے۔ بغیر غور و فکر کے کفر اور ایمان کا فلسفہ اور ان کا فرق سمجھ میں نہیں آنے والا ہے۔

سب سے پہلا مضمون جو شعر میں نظر آتا ہے وہ یہ کہ کفر کی حقیقت کا پھیلاؤ جو کچھ بھی ہے اس پر کچھ رسموں کی قید جب لگا دی جاتی ہے تو ہم اسے ایمان سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن ایسا قطعی نہیں ہے کہ بادی النظر میں جو نظر آ رہا ہے وہ صحیح ہو۔ اس شعر کا دوسرا پہلو ہمیں زیادہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ اسلام رسموں کی پابندیوں یا چند رسموں کی ادائیگی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اس سے کہیں بلند ہے۔ کفر اور اسلام میں صرف چند رسموں کا فرق ہے یا پھر اس کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ اسلام جس کے لیے ہم نے چند رسموں کی ادائیگی کا شیوہ اپنا رکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ پھیلاؤ رکھتا

ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسلام رسمیات سے بالا ہونے کا نام ہے۔ عابد، زاہد دراصل وہی ہے جو رسموں سے بالا ہوکر عبادت کرتا ہے۔ تصوف کے نکتہ نظر سے یہ بات بالکل درست نظر آتی ہے کہ سچا عاشق وہی ہے جو رسمیات سے بالا ہوکر اپنی ذات میں خدا کا ہونا محسوس کرنے لگتا ہے۔

پانچواں شعر: یہ شعر بھی پچھلے شعر کی ہی طرح فلسفیانہ ہے۔ وہ شورشیں یعنی ہنگامے، ولولے، فتنہ وفساد، جن کے دم سے دنیا میں ہماہمی، رنگارنگی، غرور اور بڑبولے پن کا طوطی بولتا ہے۔ انہیں میں سے چند کو منتخب کر کے انسان کو بنایا گیا ہے۔ ایک پہلو جو سب سے زیادہ قابل غور ہے وہ ہے آدمی اور انسان کا فرق۔ آدمی سے انسان بننے تک کا جو مرحلہ ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ غالب نے کہا ہے کہ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے آدمی کو پیدا کیا اور اسے عقل سلیم سے نوازا جس سے وہ خود اچھائی برائی کی تمیز کر کے اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جسے انسان کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اب شعر پر پھر غور کریں تو محسوس ہوگا کہ وہ شورشیں، جن کے دم سے، جن کی بدولت دنیا کے کاروبار میں ہنگامے ہے، فساد ہیں، بھاگ دوڑ ہے، نیکی وبدی کی قوتیں ہیں، انھیں میں چند اچھی چیزوں کو، چن کر آدمی اپنے آپ کو انسان بنا سکتا ہے۔ دنیا کا نظام جن ہنگاموں کے باعث چل رہا ہے۔ جس میں رہ کر آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ اسے قدرت نے سب سے اعلیٰ مرتبہ دیا ہے اور اسی لوٹ کھسوٹ دھوکا وفریب دیہی میں یہ آدمی لگ جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھ کر اگر سوچیں تو ان چیزوں میں سے چند چیزوں پر قناعت کر کے زندگی گزارنا، وہ قدریں جسے سماج پسند کرتا ہے، بہتر سمجھتا ہے۔ موہ مایا سے دور رہ کر اپنے لیے ایک خاص دائرہ بنا لینے پر اسے انسان کہا جا سکتا ہے۔ ویسے آج کے اس ہماہمی کے دور میں آدمی کبھی انسان بننے کو ترجیح نہیں دیتا۔ اور جو لوگ انسانیت کا درس دیتے ہیں انہیں بے وقوف سمجھتا ہے۔

چھٹا شعر: شاعر کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنے محبوب کے ناز وانداز کی نظر کو نیشتر یعنی زخم کھولنے کا اوزار سمجھا تھا مگر ہوا اس کا ٹھیک الٹا۔ یہاں نشتر لگانے سے مراد پھوڑے یا زخم کا ٹھیک ہونا ہے۔ لیکن عشق میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہوگا کیوں کہ یہ مرض وہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' یہی اور ایسا ہی ذکر اس

شعر میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ محبوب کی ایک ناز و انداز کی نگاہ کو ہم سمجھ رہے تھے کہ اس سے ہمارے دل کا کانٹا نکل جائے گا لیکن اب اس کا یہ حال ہو گیا ہے کہ محبوب کی مسکراہٹ ہی اس کے لیے جینے کا وسیلہ بن گئی ہے۔ اسی مضمون کو حسرت موہانی نے یوں پیش کیا ہے:

سب غلط کہتے تھے لطف یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کردیا

اب اس شعر کا مطلب یہ نکلا کہ عشق ایک ایسا مرض ہے جو لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھتا ہے۔ اصغر کا کہنا بھی یہی ہے کہ محبوب کی مسکراہٹ ہی اب ان کے جینے کا سہارا ہے جب کہ ہم نے محبوب کی نگاہ ناز کو سمجھا تھا کہ اس سے ہمارے دل کا کانٹا نکل جائے گا۔ حالانکہ جیسا سوچا تھا بالکل اس کا الٹا ہوا اور ان کی پریشانیاں بجائے گھٹنے کے اور بڑھ گئیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

8. پہلی غزل اصغر کے کس مجموعے سے لی گئی ہے؟
9. تیسرے شعر میں کیا ہے؟

1.6 اصغر گونڈوی کی غزل (2)

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے؟
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

یہ سب ناآشنائے لذت پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بہارِ سبزہ و گل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دنیا، مے کوہ آباد ہوتا ہے

بنالیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شور روشیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیاد ہوتا ہے

1.6.1 مجموعی تاثر

یہ غزل پوری طرح سے حوصلہ و ہمت، امنگ و جذبات سے لبریز ہے اور خاص طور سے غلامی، اسیری اور قید کی زندگی کے خلاف ایک موج رواں نظر آتی ہے۔ مکمل غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں منتخب اشعار کا مطالعہ یہاں درکار ہے۔ اس کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اس غزل کا ایک عنوان بھی قائم کیا جا سکتا ہے۔ جس کے اردگرد اس کے تمام اشعار کے موضوعات نظم کیے گئے ہیں۔ آزادی فطرت جیسے موضوعات بار بار باندھے گئے ہیں۔ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ غزل ملک کی سیاسی جدوجہد اور سماج کے غالب رجحان کی ترجمانی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول کا عہد اس غزل میں سانسیں لیتا نظر آتا ہے۔ ایسا شاید ہی ہوتا ہو کہ کوئی ادیب اپنے سماج سے بالکل ہی بے بہرہ ہو اور اس کی ترجمانی اپنی تخلیق میں نہ کرتا ہو۔ کیونکہ آنے والے زمانے کے لیے وہی ادیب بڑا ثابت ہوا ہے جو اپنے عہد کے غالب رجحانات کی ترجمانی اپنے لہجے میں کرتا رہا ہے۔ خواہ نظم ہو یا نثر۔ اس غزل کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں یہ بات بار بار یاد آ رہی ہے کیونکہ اس وقت آزادی کے لیے مختلف تحریکیں چل رہی تھیں۔ لہٰذا اصغر نے بھی اپنے کلام سے لوگوں کو حوصلہ عطا کیا اور آزادی کا جذبہ ان میں بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن کبھی عنان تغزل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یعنی فن اور مقصد دونوں میں اعتدال بنائے رکھنے کی کوشش کی۔ غزل کے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اس میں وقت کو سمونے کی کوشش کی اور ایک معتدل رویہ اپنا کر ملک والوں کو اپنا پیغام دینے کی کوشش کی۔ اس میں بھی اصغر کا ایک لب و لہجہ ہے جس سے وہ کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ یہی ان کی غزلوں کی انفرادیت ہے کہ وہ کبھی بھی معیار سے فروتر کوئی بات نظم نہیں کرتے۔

1.6.2 تشریح

پہلا شعر: اس شعر میں ''محمل نشیں'' کلیدی لفظ ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد شعر کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ ''محمل نشیں'' دراصل لیلا کا استعارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی معشوقہ کیوں خوش یا ناراض ہوتی ہے؟ جب کہ عاشق کا اپنے دیوانے پن پر کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ اس کے جذبات خود اسے بربادی کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس شعر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ''محمل نشیں''، یعنی محمل میں رہنے والا خوش ہو، ناراض ہو، اس سے عاشق کی فطرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اسے اس کا دیوانہ پن صحرانوردی پر مجبور کرتا ہے اور وہ دھوپ، چھاؤں، پیاس اور صحرا کی سختیوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لیے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

اس شعر کا تیسرا پہلو یہ ممکن ہے کہ پردے میں رہنے والا، محمل میں رہنے والا خواہ ناراض ہو یا خوش اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ بہرحال محمل میں ہے اور عشق کی سختیوں سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ عشق کی سختیوں کو تو بس عاشق ہی جانتا ہے۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں خود کو مجبور پاتا ہے اور خود اپنی بربادی کے لیے سامان مہیا کرتا ہے۔ اس لیے عاشق کی دیوانگی پر، محبوبہ کے شاد یا ناشاد ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ عاشق خود اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ اس لیے محمل نشیں کو ناشاد یا شاد نہیں ہونا چاہیے۔

دوسرا شعر: شاعر آزادی اور غلامی کے فرق کو سمجھانا چاہتا ہے اور عوام میں جذبۂ بیداری پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ قیدی یا وہ لوگ جو اسیر ہیں اور اپنی اس اسیری کے لیے صیاد کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ شاید انہیں آزادی کا لطف حاصل نہیں ہے۔ چونکہ اپنا مافی الضمیر شاعر پرواز اور صیاد کے ذریعے ادا کر رہا ہے اس لیے بات پرواز اور صیاد کے استعارے سے کہی گئی ہے ورنہ بات یہی ہے کہ ہمارے لوگ اگر آزادی کی لذت سے آشنا ہوتے تو شاید شکوہ صیاد نہ کرتے اور قفس کی تیلیاں توڑ کر آزاد ہو جاتے۔

اپنی اسیری کا شکوہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہم میں جذبۂ آزادی ابھی بیدار نہیں ہوا ہے ورنہ ہم قفس کی تیلیوں کو توڑ کر آزاد ہو جاتے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمیں ابھی تک آزادی کی لذت ہی نہیں ملی ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر کو سہل ممتنع کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بہار سبزہ و گل ہے یعنی موسم بہار ہے اور گلشن پوری طرح گلزار ہے اور یہ سب ساقی کے کرم سے ہی ہے۔ لہٰذا جب گلشن میں اس طرح کا موسم ہوتا ہے تو رند اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتے اور مے کدہ آباد ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہار کا موسم ہے ہر طرف پھول کھل رہے ہیں اور جب سبزہ و گلپر شباب ہے تو پھر ایسی

کیفیت میں مے کدہ کا آباد ہونا لازم ہو جاتا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہو سکتا ہے کہ پھولوں کے کھلتے ہی میکدہ آباد ہوتا ہے کیونکہ ان کا عرق شہد کی مکھیاں تو کشید کر لے ہی جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ پھولوں کی خوشبو کو شراب میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی ممکن ہے کہ ایسے بہار کے موسم میں ساقی کا کرم ہے کہ خوشبودار شراب کا اہتمام کیا ہے جس کے باعث میکدہ آباد ہو گیا ہے۔

چوتھا شعر: یہ شعر جذبے کی پختگی کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ شخص جو کہ قید ہے اور جس کی فطرت میں آزادی رچی بسی ہوئی ہے وہ اپنے خون کی موجوں سے ایک چمن آباد کر لیتا ہے۔ یعنی ہندوستانیوں کی فطرت میں ابھی آزادی سمائی نہیں ہے' انہیں آزادی کے بارے میں ابھی کچھ معلوم ہی نہیں ہے ورنہ وہ اپنے خون سے اپنا چمن آباد کر لیتے۔ خون سے چمن آباد کرنے سے مراد آزادی کے لیے اپنا تن من دھن نثار کر آزادی لے لیتا ہے ۔اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔ جو کہ ''پابند'' اور ''آزاد'' سے قائم ہوتی ہے۔

پانچواں شعر: اصغر کہتے ہیں کہ زمانہ شعور و غوغا اور ہنگامے کا عادی ہوتا جا رہا ہے لیکن میں اپنی دنیا میں ہی گم ہوں۔ میں اپنے دل کا درد ظاہر نہیں کرتا۔ بغیر کسی شور و نالہ کے اپنے درد کو سنبھالے ہوئے رکھتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمانہ جس چلن کا خوگر ہوتا جا رہا ہے' اس سے منفرد اپنا مزاج ہے۔ ویسے بھی ہم جانتے ہیں کہ اصغر اپنی ذاتی زندگی میں صوفیانہ فطرت کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے میں جس چیز کا یعنی شور و ہنگامے اور آہ و بکا کا جو چلن تھا اس کا اثر اصغر کی زندگی پر نہیں ہوا اور وہ اپنے کرب کو سینے ہی میں دفن کرتے رہے۔

چھٹا شعر: اس شعر میں سب سے پہلے ''یہاں'' پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہاں ''یہاں'' سے کیا مراد ہے ؟ میں جہاں تک سمجھتا ہوں۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک ''دنیا'' اور دوسرا ''وقت''۔ اگر ''دنیا'' کے اعتبار سے غور کریں تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ دنیا ہے جہاں آدمی کو ہر گھڑی متحرک رہنا چاہیے ورنہ وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکے گا اور مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ کیونکہ جیسے ہی ہم میں غفلت آئی دوسرے لوگ ہمیں پیچھے چھوڑ دیں گے اور زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں گے۔

''وقت'' اس دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

وقت کی قدر کروگے تو سنور جاؤگے

وقت ہر شئے سے زمانے میں بڑا ہوتا ہے

اس لیے ابھی اسی وقت جو کرنا ہے سو کرنا ہے' کل پہ اکتفا کرنا ایک طرح کی غفلت یا کاہلی ہے۔ جس نے اپنے کام کو کل پر ٹالا وہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ اس لیے عمل میں ذرا سی بھی کوتاہی ہمیں ہمیشہ کے لیے دام مصیبت میں مبتلا کرسکتی ہے۔ ایک اور پہلو جو اس شعر میں ممکن ہوسکتا ہے جب آدمی خود اپنا کام کرنا نہیں چاہتا تو اس کے لیے پچاس مشکلیں کھڑی نظر آتی ہیں اور جب کرنے پر کمر کس لیتا ہے تو پچاس راستے بھی نکل آتے ہیں۔ جب پرندے خود اڑنا نہیں چاہیں گے تو ظاہر ہے جال میں آ ہی جائیں گے لیکن جب وہ آزاد رہنے کے لیے اپنے پر پھڑ پھڑائیں گے تو یقیناً کوئی نہ کوئی راستہ تو نکل ہی آئے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. تشبیہہ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
11. اصغر گونڈوی کس عہد کے شاعر ہیں؟
12. اس غزل کا مرکزی موضوع کیا ہے؟

1.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اب تک اصغر گونڈوی کی حیات' شاعری کی خصوصیات اور جدید غزل میں ان کے مرتبے کی بات کی۔ جس سے آپ کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اصغر کس طرح کے آدمی تھے اور شاعری کے کس معیار کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے دونوں شعری مجموعے ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ دونوں مجموعے بہت مختصر ہیں لیکن اردو دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں میں اصغر کی شاعری' اس کے معیار اور ان خاص نکات کی ہم نے نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے' جن کا ذکر اصغر کے یہاں بار بار ہوتا

ہے۔ فلسفے سے ان کو خاصا لگاؤ تھا اور تصوف سے بھی۔ اس سے انہوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور مختلف قسم کے نظریات پر حامل اشعار بھی کہے ہیں۔ ایسے اشعار بغیر فلسفیانہ خیالات کو سمجھے، سمجھ میں نہیں آ سکتے لہذا اکثر کی تعریف بھی پچھلے صفحات میں درج کی گئی ہے امید ہے کہ اس سے طلبہ کو فیض حاصل ہوا ہوگا۔

کلاسیکی غزل کا یہ شاعر تشبیہات، استعارات اور علامات کے ذریعے اپنے کلام کی طرف لوگوں کو راغب کرتا ہے۔ خالص غزل کے موضوعات تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہوئے بھی بعض غزلوں میں زمانہ کی روش اور عوامی جذبات کی بھی نمائندگی انہوں نے بہ خوبی کی ہے۔ اس عہد میں جس طرح کا سیاسی و سماجی منظر نامہ تھا ان اشعار سے ان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دو غزلوں کی شرح بھی متن کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ طلبہ اس اکائی سے اصغر گونڈوی کی شخصیت اور ان کی شاعری سے خاطر خواہ واقفیت حاصل کر سکیں گے۔ آخر میں فرہنگ اور مزید مطالعے کے لیے کتابوں کے نام درج کیے گئے ہیں جن سے باذوق طلبہ یقیناً استفادہ کریں گے۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 ۔اصغر گونڈوی کی شخصیت سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

2 اصغر کے فلسفیانہ نکات کی نشاندہی کیجیے۔

3 اصغر کے کلام میں ندرت بیان پر ایک نوٹ لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 اصغر گونڈوی کے حالات زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2 اصغر گونڈوی کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کے اظہار پر ایک مضمون سپرد قلم کیجیے۔

3 اصغر کی شاعرانہ خصوصیات کی نشاندہی کیجیے۔

1.9 فرہنگ

گردن زدنی واجب القتل، قتل کیے جانے کا سزاوار، قتل کیے جانے کا مستحق

سوز و گداز وہ کیفیت جس سے متاثر ہو کر رقت طاری ہو/رونا آئے

حسرت و یاس کسی چیز کے نہ ملنے کا افسوس، آرزو، ارمان، شوق

سلوک تلاش حق، نیک روی، صوفیوں کی اصطلاح میں حق تعالیٰ کی طلب

اسرار و معارف خدا کے راز، خدا کے بھید خدائی، خداوندی، شان خداوندی

وارفتگی بے خودی، آپے سے باہر ہونے کی حالت فرسودہ پرانا، گھسا ہوا، پھٹا ہوا

ابتذال اخلاقی پستی، کمینہ پن، شاعری کا ہلکا پن ندرت عمدگی، انوکھا پن

آہ و فغاں رونا پیٹنا، نالہ و فریاد صہبا ایک قسم کی لال شراب، سفید انگوروں کی شراب

جوئے بار ایسی بڑی نہر جس میں بہت سی نہریں آ کر مل جاتی ہوں، پہاڑ کا دامن

فروتر کم تر، نچلا پروردہ پالا ہوا، بسایا ہوا، پرورش کیا ہوا

کورانہ اندھوں کی طرح امتزاج ملاوٹ، ہم آہنگی، آمیزش

بادی النظر دیکھتے ہی، سرسری نظر سے عنان باگ، لگام، باگ، ڈور

خیرہ تاریک، اندھیرا، حیران پریشان مستور چھپا ہوا، پوشیدہ

معراج بلند مرتبہ، درجہ اعلا، ایسا رتبہ یا درجہ جس سے زیادہ تصور میں نہ آ سکے۔

1.10 معاون کتابیں

1. اصغر گونڈوی نشاطِ روح اتر پردیش اردو اکادمی۔ لکھنؤ۔ 1982

2. اصغر گونڈوی سرودِ زندگی اتر پردیش اردو اکادمی۔ لکھنؤ۔ 1982

3. کلیات اصغر کرشن کانت آزاد بک ڈپو امرتسر 1977

4. کلیات اصغر (مقدمہ) مجنوں گورکھپوری ناز پبلشنگ ہاؤس پہاڑی بھوجلہ دہلی

5. تاریخ ادب اردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک جلد چہارم سیدہ جعفر حیدرآباد

1.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1 اصغر حسین

2 گورکھپور میں

3 ریلوے میں ٹائم کیپر کی

4 عبدالغنی منگلوری

5. تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی پردہ محمل اٹھا تو صاحب محمل نہ تھا

6 پرانے خیال کو اس کی جگہ قائم رکھ کر طرز ادا سے اس میں نئی روح پھونکنے کو ندرت بیان یا ندرت ادا کہتے ہیں۔

7 نہ ہوگا مستی بے مدعا کا راز داں برسوں وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

8. ''سرود زندگی'' سے اخذ کی گئی ہے۔

9. تیسرے شعر میں تشبیہ ہے۔

10 جب ایک شئے کو دوسری کے مماثل کہتے ہیں وہ بھی اس طرح کہ جس کے لیے تشبیہ دی گئی ہے اس کا حسن بڑھ جائے۔

11. اصغر بیسویں صدی کے نصف اول کے شاعر ہیں۔

12. اس غزل کا مرکزی خیال عمل پیہم اور جذبۂ آزادی قرار دیا جاسکتا ہے۔

اکائی 2 : یگانہ چنگیزی

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 یگانہ چنگیزی: حیات

2.4 یگانہ کی شاعرانہ خصوصیات

2.5 یگانہ کی غزل (1)

2.5.1 مجموعی تاثر

2.5.2 اشعار کی تشریح

2.6 یگانہ کی غزل (2)

2.6.1 مجموعی تاثر

2.6.2 اشعار کی تشریح

2.7 خلاصہ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 معاون کتابیں

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں یگانہ چنگیزی کی حیات اور شخصیت کا اجمالی تذکرہ اور ان کی شاعری کی خصوصیات کو اجاگر

کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یگانہ کی دو غزلیں بھی شامل کی جارہی ہیں۔ ان دونوں غزلوں پر مجموعی تبصرے کے ساتھ ہی ساتھ تمام اشعار کی تشریح عام فہم زبان میں کی جائے گی۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد امید کی جاتی ہے کہ آپ یگانہ کی شاعری، ان کے رنگ و آہنگ اور ان کے منفرد لب و لہجے سے خاطر خواہ واقف ہو سکیں گے۔

2.2 تمہید

بیسویں صدی کے نصف اول میں جن شعرا کے حصے میں بہت زیادہ شہرت و مقبولیت آئی، ان میں یاس یگانہ چنگیزی کا بھی نام آتا ہے۔ البتہ یہ بات بالکل الگ ہے کہ ان کو جتنی مقبولیت اپنی شاعری سے حاصل ہوئی اس سے زیادہ تشہیر ''غالب شکن'' ہونے کے باعث نصیب ہوئی۔ ان کی شاعری اور شخصیت کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ ان کا تعلق کسی دبستان سے نہیں تھا۔ روزمرہ، محاورے اور زبان کے در و بست پر انہیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ یگانہ کی شاعری اور شخصیت سے طلبہ کو واقف کرانے کی غرض سے یہ اکائی شامل نصاب ہے۔

2.3 یگانہ چنگیزی: حیات

نام مرزا واجد حسین۔ پہلے یاسؔ تخلص کرتے تھے۔ بعد میں یگانہ ہو گئے۔ آپ کے اجداد ایران سے ہندوستان آئے۔ یگانہ چنگیزی 27 ذی الحجہ 1301ھ مطابق 17 اکتوبر 1884ء کو پٹنہ کے محلے مغل پورہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ چھ سال کی عمر سے مکتب میں داخل ہوئے۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں نام لکھوایا گیا۔ اسکول میں ہمیشہ اول رہے۔ ہر سال وظیفہ اور انعام پاتے رہے۔ 1903ء میں انٹرنس پاس کیا۔ 1904ء میں مٹیا برج، کلکتہ تشریف لے گئے جہاں شہزادہ مرزا مقیم بہادر کے صاحب زادوں شہزادہ محمود یعقوب علی مرزا اور شہزادہ محمد یوسف علی مرزا کی انگریزی تعلیم کے استاد مقرر ہوئے۔ لیکن کلکتہ کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور کچھ دنوں بعد وطن واپس چلے آئے۔ علاج کے سلسلے میں لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کی فضا ایسی راس آئی کہ اچھے ہو کر بھی واپس جانا گوارا نہیں کیا۔ لکھنؤ ہی میں 1913ء میں شادی کر کے اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔

یگانہ کا لکھنؤ کا قیام بڑا ہنگامہ خیز اور معرکہ آرا رہا۔ جس کا اثر ان کے فن پر بھی پڑا۔ معرکہ آرائیوں نے بھی

ان کے فن کو جلا بخشی۔ شروع میں لکھنؤ کے شعرا سے ان کے تعلقات خوشگوار تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ عزیز، صفی، ثاقب و محشر وغیرہ کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ جب عزیز کی سرپرستی میں رسالہ ''معیار'' جاری ہوا اور معیار پارٹی وجود میں آئی تو یگانہ بھی اس پارٹی کے مشاعروں میں غالب کی زمینوں میں غزلیں پڑھتے تھے۔ ان طرحی مشاعروں کی جو غزلیں ''معیار'' میں چھپی ہیں ان میں بھی یگانہ کی غزلیں شامل ہیں۔ لیکن یہ تعلق بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور لکھنو کے اکثر شعرا سے یگانہ کی چشمک ہوگئی۔ اس سلسلے میں مالک رام بہ زبان یگانہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''اب اس میں میرا کیا قصور! یہ خدا کی دین ہے، میرا کلام پسند کیا جانے لگا۔ باہر کے مشاعروں میں بھی اکثر جانا پڑتا۔ میری یہ ہر دل عزیزی اور مقبولیت ان تھڑدلوں سے دیکھی نہ گئی۔''

(صفحہ 20، مرزا یگانہ چنگیزی، مضمون مشمولہ میرزا یگانہ: شخصیت اور فن)

یگانہ سے اہل لکھنؤ کی چشمک کا معاملہ کچھ یوں تھا کہ ''معیار'' پارٹی کے مشاعروں میں ان کے کلام پر خندہ زنی کی جاتی تھی اور بے سروپا اعتراض کیے جاتے تھے مگر یہ سب کچھ زبانی ہوتا تھا۔ اصلی اور تحریری جنگ کا آغاز خود یگانہ نے کیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے خلاف لکھنے کا سلسلہ چل پڑا، جس کی انتہا ''شہرت کاذبہ'' نامی یگانہ کی کتاب ہے۔ لکھنؤ کے شعرا غالب کے بڑے قائل تھے لہذا یگانہ کے لیے اب یہ بات بھی ناگزیر ہوگئی کہ وہ غالب کی بھی مخالفت کریں۔ غالب کی مخالفت کے سلسلے میں انہیں اندھا مخالفت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ انہوں نے خود کہا ہے کہ

''یہ کس نے آپ کو بہکا دیا کہ میں غالب کا مخالف ہوں، وہ یقیناً بہت بڑا شاعر ہے۔ صاحب! غالب کی صحیح قدر و منزلت مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ مجھے غصہ اس بات پر آتا ہے کہ لوگ اس کے جائز مقام سے زیادہ اسے دینا چاہتے ہیں۔ اور پھر قسم یہ ہے کہ یہ بھی وہ لوگ نہیں، جو اس کا صحیح مقام سمجھتے ہوں، بلکہ وہ جو تقلیداً اسے بڑا سمجھتے ہیں..... تو صاحب! میں غالب کے خلاف نہیں تھا، اور نہ ہوں لیکن میں اس کی جائز جگہ سے زیادہ اس کے حوالے کر دینے پر تیار نہیں۔'' (مضمون از مالک رام)

یگانہ نے اس مخالفت کے چلتے اپنے آپ کو ''آتش کا مقلد'' کہنا شروع کر دیا اور اپنے مجموعۂ کلام

''نشتر یاس'' کے سرورق پر اپنے نام سے پہلے ''خاک پائے آتش'' لکھا اور جب اس کے ایک سال بعد ''چراغ سخن'' شائع ہوا تو انہوں نے اپنے آپ کو ''آتش پرست'' کے درجے تک پہنچا دیا۔ اسی بنیاد پر انہون نے آتش اور غالب کا تقابلی مطالعہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آتش، غالب سے بڑا شاعر ہے۔ یہ مضمون رسالہ ''خیال'' میں نومبر 1915ء میں شائع ہوا اور یہ سلسلہ ایک لمبی مدت تک جاری رہا۔ اس غالب شکنی کی انتہا وہ رسالہ ہے جو انہوں نے 1934ء میں ''غالب شکن'' کے نام سے شائع کیا۔ دوبارہ اسے مزید اضافوں کے ساتھ 1935ء میں چھاپا۔ اس مخالفت کی وجہ سے یگانہ کا اچھا خاصا وقت ضائع ہو گیا کیونکہ اس مخالفت سے نہ تو شعرائے لکھنو کا کچھ ہوا اور نہ ہی غالب کو کچھ نقصان پہنچا بلکہ یگانہ ہی خسارے میں رہے کہ اپنی شاعری پر پوری طرح توجہ نہ دے سکے۔

ان سب مخالفتوں اور معرکہ آرائیوں کے باوجود یگانہ کا ایک گروپ تھا، جن سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ 1919ء میں انہوں نے ''انجمن خاصانِ ادب'' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے صدر بے خود موہانی، سکریٹری یگانہ اور جوائنٹ سکریٹری عبدالباری آسی تھے۔ اس انجمن کے اعزازی رکن اور سرپرستوں میں فصاحت لکھنوی اور سید مسعود حسن رضوی ادیب جیسے لکھنوی اہل قلم شامل تھے۔

زندگی کے دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ یگانہ کی ملازمت کا سلسلہ بھی ناہمواری کا شکار رہا۔ ایک عرصے تک وہ ''اودھ اخبار'' سے وابستہ رہے۔ لیکن حتمی طور سے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب سے کب تک البتہ ''اودھ اخبار'' کے اڈیٹروں میں یگانہ کا نام شامل ہے۔ 1924ء میں یگانہ اٹاوہ چلے گئے۔ جہاں انہیں اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی۔ مارچ 1925ء کے آس پاس وہ اٹاوہ کو چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے۔ وہاں ایک پریس میں انہیں ملازمت مل گئی۔ 1926ء میں انہوں نے لاہور کا رخ کیا اور ''اردو مرکز'' سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں کا ماحول انہیں راس آیا۔ یہاں کے ادیبوں سے ان کے بہتر مراسم رہے۔ کئی کتابوں اور رسالوں کے چھپنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ اقبال کے یہاں بھی ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ اقبال بھی یگانہ کے بڑے قائل تھے۔ 1927ء میں یگانہ ''اردو مرکز'' سے علاحدہ ہو گئے لیکن قیام لاہور ہی میں رہا۔ لاہور کے بعد انہوں نے حیدرآباد دکن کا رخ غالباً 1928ء میں کیا۔ حیدرآباد میں

حیدرآباد میں ان کا قیام ان کے لیے کافی آسودگی لے کر آیا۔ یہاں وہ نثار احمد مزاج کے توسط سے محکمہ رجسٹریشن میں ''نقل نویس'' کی حیثیت سے مقرر ہوگئے۔ یہاں ان کی آمدنی 30-25 روپے ماہوار تھی کبھی کبھی زیادہ بھی ہوجاتی تھی۔ 1931ء میں یگانہ محکمۂ رجسٹریشن میں باقاعدہ ملازم ہوگئے۔ یہ جگہ سب رجسٹرار کی تھی۔ اس طور سے وہ ''عثمان آباد''۔ ''لاتور'' اور ''یادگیر'' میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور 1942ء میں 58 برس کی عمر میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک لمبے عرصے تک حیدرآباد ہی میں قیام رہا۔ 1946ء میں وہ بمبئی گئے اور ہاں اپنے بڑے بیٹے آغا جان کو ملازمت دلوائی۔ حیدرآباد میں نواب معظم جاہ نے انہیں اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا لیکن یگانہ راضی نہ ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یگانہ بار بار حیدرآباد روزگار کی امید سے آتے رہے لیکن انہیں مایوسی ہی نصیب ہوئی۔ ان کے حالات دن بہ دن ابتر ہوتے گئے اور اسی عالم میں انہوں نے تین یا چار فروری 1956ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

یگانہ کا پہلا مجموعۂ کلام ''نشتر یاس'' 1914ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا بڑا حصہ ان کے ابتدائی اور روایتی کلام پر مشتمل ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''آیات وجدانی'' کے نام سے 1927ء میں منظر عام پر آیا۔ یگانہ کی قدر و منزلت کا دارومدار بڑی حد تک اسی مجموعے پر ہے۔ ''آیات وجدانی'' کے بعد ان کا تیسرا مجموعہ ''ترانہ'' کے نام سے سات سال بعد 1933ء میں شائع ہوا۔ 1934 میں ''آیات وجدانی'' کا دوسرا اڈیشن منظر عام پر آ گیا۔ 46-1945ء میں اس مجموعے کا تیسرا اڈیشن بھی آ گیا۔ اس اشاعت کا کام پہلی اشاعتوں سے بہتر تھا۔ 1946ء میں جب یگانہ بمبئی گئے تھے۔ اس وقت ان کی ملاقات سید سجاد ظہیر سے ہوئی تھی۔ ان کے لیے یگانہ نے اپنے تمام مجموعوں میں شامل کلام کو ''گنجینہ'' کے نام سے مرتب کر دیا۔ یہ مجموعہ کمیونسٹ پارٹی کے اشاعتی ادارے سے 1947ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے چند کتابچے بھی لکھے تھے۔ مثلاً ''شہرت کاذبہ'' جسے خرافات عزیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''غالب شکن'' بھی شائع کیا تھا جس سے لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بڑی اٹھا پٹک ہوئی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. یگانہ کا اصل نام کیا تھا؟
2. وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟
3. یگانہ کے شعری مجموعوں کے نام بتایئے۔

2.4 یگانہ کی شاعرانہ خصوصیات

یگانہ ایک کلاسیکی غزل گو شاعر تھے۔ حالانکہ انہوں نے قطعات و رباعیات بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی اصل پہچان ان کی غزلیں ہی ہیں۔ انہوں نے غزل کے موضوعات کے دائرے کو ایک نئی جہت اور اونچائی عطا کی اور ایسے مضامین نظم کیے جو پہلی بار حقیقت پسندانہ کیفیت کے ساتھ غزل کے افق پر نمودار ہوئے۔ وہ خود اپنی ذاتی زندگی میں جس طرح کے شیریں و تلخ تجربات سے گزرے تھے اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کا جس طرح تجربہ کیا تھا۔ اس سے ان کے دل و دماغ نے جو تاثرات قبول کیے تھے۔ انہیں واقعات نے ان کی غزلوں کو اصلیت پسندی اور تابناکی بخشی۔ ان کی غزل گوئی ان کے مزاج کی آئینہ دار ہے۔ وہ ایک خوددار اور صاف گو انسان تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی اس کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

یگانہ کی شاعری میں جو چیز سب سے پہلے دل پر اثر کرتی ہے وہ ہے ان کا زور کلام۔ بندش کی چستی کے علاوہ بلند بانگ مضامین کے لیے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو پوری طرح مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے ساتھ ساتھ خیالات کو بھی جلا دیتے ہیں۔ دوسری چیز جو ان کی شاعری میں دلکشی پیدا کرتی ہے وہ ہے ''طنز'' ان کی شاعری کا یہ عنصر کہیں کہیں اتنا تیز اور تیکھا ہوتا ہے کہ زور بیان کا لطف دوبالا کر دیتا ہے۔

انسان کا انسان فرشتے کا فرشتہ — انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا — خدا تھے کتنے مگر کوئی آڑے آنہ گیا

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے — کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

حال دونوں کا ہے غیر اب سامنا مشکل کا ہے　　دل کو میرا درد ہے اور مجھ کو رونا دل کا ہے

جو خاک کا پتلا ' وہی صحرا کا بگولہ　　مٹنے پہ بھی اک ہستی برباد رہے گی

''دردِدل کے واسطے پیدا کیا انسان کو''　　زندگی پھر کیوں ہوئی ہے دردِ سر میرے لیے

یگانہ کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی اور فکر کی بالیدگی دیکھتے ہی بنتی ہے۔ وہ حقائق کو عالم بالا سے چن کر لاتے ہیں اور نہایت صفائی وسادگی کے ساتھ اشعار میں سمو دیتے ہیں۔ بندش ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ وتراکیب میں مطلب ومفہوم الجھنے نہیں پاتا۔ ان کے کلام میں زیادہ تر حوصلہ اور ہمت افزائی کی لہریں موجزن نظر آتی ہیں۔ مصیبتوں میں گھر جانے کے باوجود یہی پیغام ملتا ہے کہ ہمت کسی بھی صورت میں ہارنا نہیں چاہیے۔

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا　　ہمیں سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

بزم دنیا میں یگانہ ایسی بیگانہ روی　　میں نے مانا عیب ہے لیکن ہنر میرے لیے

رات دن شوقِ رہائی میں کوئی سر پٹکے　　کوئی زنجیر کی جھنکار سے دیوانہ بنے

واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دور شباب　　جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا

باز آ ساحل پہ غوطے کھانے والے باز آ　　ڈوب مرنے کا مزہ دریائے بے ساحل میں ہے

بلند ہوتو کھلے تجھ پر راز پستی کا　　بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

یگانہ ایک خوددار، حق گو اور بے باک انسان تھے اور یہی خصوصیات ان کے کلام میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی خودداری کہیں کہیں ''انا پرستی'' سے جاملتی ہے۔ جسے بعض ناقدین نے ان کی ''کجروی'' سے تعبیر کیا ہے۔ اپنے دور میں انہیں وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کی زندگی کشمکش، آزمائش اور اتار چڑھاؤ سے عبارت تھی، اس کے باوجود ان کی شاعری میں زندگی سے فرار، مایوسی اور پست ہمتی کی کوئی جگہ نہیں ہے زندگی کے ہر مرحلے کو طے کرنے کی ان میں جرات تھی۔ میرا خیال ہے کہ شاید اسی وجہ سے ان کے کلام میں مایوسی، قنوطیت اور حرماں نصیبی نہیں پائی جاتی۔

ہنوز زندگی تلخ کا مزا نہ ملا — کمال صبر ملا صبر آزمانہ ملا

بہار آئے گی پھر یاس ناامید نہ ہو — ابھی تو گلشن ناپائدار باقی ہے

دل ہے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں — وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں، کون ہوں، کیا ہوں — سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں؟ — اسیرو، بیٹھے کیا ہو گوش بر آواز در ہوکر

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف — کان اب تک ہوس بانگ درا کرتے ہیں

یگانہ کے کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں فارسی ترکیبوں کے استعمال سے کافی لگاؤ تھا۔ تشبیہات کی جدت سے طرز بیان میں تازگی پیدا کرتے ہیں۔ مصرعے نہایت چست ہوتے ہیں۔ الفاظ کی بندش سے اشعار میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

وحشت آباد عدم ہے وہ دیارِ خاموش — کہ قدم رکھتے ہی ایک ایک سے بیگانہ بنے

حسن وہ حسن کبھی جس کی حقیقت نہ کھلے — رنگ وہ رنگ جو ہر رنگ میں شامل ہوجائے

چشم نامحرم سے، غافل، روئے لیلیٰ ہے نہاں — ورنہ اک دھوکا ہی دھوکا پردۂ محمل کا ہے

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے — آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجیے

یگانہ نے صرف اپنا تخلص ہی یاس سے یگانہ (1920-21 میں) نہیں کیا بلکہ 1932ء تک پہنچتے پہنچے اس میں چنگیزی کا اضافہ بھی کرلیا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس طرح چنگیز نے اپنی تلوار سے دنیا کا صفایا کردیا تھا اسی طرح جب سے میں نے غالب پرستوں کا صفایا کرنے کا تہیہ کیا ہے، یہ لقب اختیار کیا ہے۔'' (بحوالہ: یگانہ سوانحی خاکہ مشمولہ، کلیات یگانہ چنگیزی، صفحہ 68)

یہ تبدیلی صرف تخلص تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نظریات وافکار میں بھی تبدیلی کی دلالت ہے،

اہل لکھنؤ سے ان کے معرکے نے انہیں اور خودسر اور خوداعتماد بنا دیا۔ انہیں معرکوں کے باعث ان کے لہجے میں تیزی آ گئی۔ آیئے یگانہ کے کلام سے کچھ ایسے شعر دیکھتے چلیں جن سے ان کے لہجے کا انوکھا پن ہی نہیں بلکہ تیکھا پن بھی سامنے آ جائے۔

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں

کلام یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا

دن چڑھے سامنا کرے کوئی
شمع کیا شمع کا اجالا کیا

صبر کرنا سخت مشکل ہے، تڑپنا سہل ہے
اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

مندرجہ بالا اشعار یگانہ کی یگانہ روی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کا کلام ان کے کسی ہم عصر سے کم تر نہیں ہے۔ روزمرہ محاوروں کا استعمال، طرز ادا، روانی اور بے ساختگی یگانہ کی خاص پہچان بن گئے تھے۔ ان کی شاعری کی خصوصیات پر گفتگو ہو اور بات رباعیوں کی نہ کی جائے تو ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں بھی ایک طرح کی جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ دیگر شعرا سے ان کا رنگ الگ رہے۔ اس فراق میں انہوں نے ایسی بندشیں اور محاورے استعمال کیے جو منجھے ہوئے نہیں تھے یا جن پر زبان کی صفائی نے ابھی تک جلا نہیں کی تھی۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ یگانہ کو رباعی کے فن پر کامل عبور تھا۔ وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ رباعی کے چوتھے مصرعے میں خیال کی تان ٹوٹتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیاں ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ انہوں نے غالب کے کلام پر بھی رباعی میں اظہار خیال کیا تھا۔ یگانہ کی رباعیوں کے مجموعے کا نام ''ترانہ'' ہے جسے کافی سراہا گیا ہے۔ ان کی رباعیوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے تمام تر رباعیوں کو عنوان دے کر رقم کیا ہے۔ مثلاً: ''تحفۂ درد''

دل کو پہلے ٹٹول لیتا ہوں
پھر تحفۂ درد مول لیتا ہوں

آثارِ زلال و درد و مستی و خمار
آنکھوں آنکھوں میں تول لیتا ہوں

''حسن دوروزہ''

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید　　کیوں، چاند کو گھن میں نہیں دیکھا شاید
اے حسن دو روزہ پہ اکڑنے والو　　یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

''ٹیڑھے مرزا''

شاہوں سے مری کلاہ ٹیڑھی ہی رہی　　بدمغزوں سے رسم و راہ ٹیڑھی ہی رہی
ٹیڑھے مرزا کو کون سیدھا کرتا　　سیدھی نہ ہوئی نگاہ ٹیڑھی ہی رہی

یگانہ نے غالب شکنی کے باعث بڑی بدنامی مول لی۔لیکن یہ بدنامی ایسے ہی نہیں تھی بلکہ انہوں نے بہت سی رباعیاں اس سلسلے میں کہی تھیں۔ان کی اس رنگ کی بھی چند رباعیاں پیش ہیں تا کہ حقیقت کا اندازہ کیا جا سکے۔

غالب کے سوا کوئی بشر ہے کہ نہیں　　اوروں کے بھی حصے میں ہنر ہے کہ نہیں
مردہ بھیڑوں کو پوجتا ہے ناداں　　زندہ شیروں کی کچھ خبر ہے کہ نہیں

.....

اللہ ری ہوا وہو میں خلعت و زر　　مرزا کا سر ہے اور انگریز کا در
ہاں کیوں نہ ہوں مورکھوں کے دیوتا غالب　　ہے باؤلے گاؤں اونٹ بھی پرمیشر

یگانہ چنگیزی کی شاعرانہ خصوصیات پر اس سے زیادہ کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔پھر بھی ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ان کے خاص خاص رنگوں سے طلبہ کو واقفیت ہو جائے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. یگانہ نے کس سن میں اپنا تخلص یاس سے یگانہ کیا؟

2.5 یگانہ کی غزل (ا)

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا؟ ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا؟

اسی فریب نے مارا، کہ کل ہے کتنی دور اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا؟

کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا؟

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو، تو کھلے تجھ پر زور پستی کا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا؟

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں، تو زیبا ہے وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا؟

خدا ہی جانے یگانہ! میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا؟

2.5.1 مجموعی تاثر

یگانہ کی یہ غزل ان کے مجموعہ کلام ''آیات وجدانی'' سے اخذ کی گئی ہے۔ ''آیات وجدانی'' ان کا سب سے اہم مجموعہ کلام ہے، جو ان کی زندگی ہی میں تین بار شائع ہو چکا تھا۔ اس غزل میں سب سے پہلے بات جو قاری کو متاثر کرتی ہے وہ ہے اس کی زبان۔ اس قدر آسان اور عام فہم الفاظ سے غیر معمولی کام لینا انہیں کا شیوہ ہو سکتا ہے جو زبان پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو۔ اس بات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پوری غزل میں ایک دو لفظ کو چھوڑ کر بقیہ زبان وہ ہے جو عام طور سے لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں مگر جس طرح کے مضامین نظم کیے گئے ہیں وہ قاری کو لاجواب کر دیتے ہیں۔ اس غزل کو ہم استفہامیہ غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح ردیف ''کیا کیا'' کی تکرار سے شاعر نے ایک فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی اس میں تنوع پیدا کرنے کی سعی کی ہے وہ ایک انوکھی چیز ہے۔ 'کیا' ایک عام لفظ ہے جس کا استعمال ہر خاص و عام صبح و شام کرتا ہے لیکن اس غزل میں جس طرح سے 'کیا کیا'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس نے اسے ایک نئی وسعت عطا کی ہے اور شعر میں اس سے گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی ہے۔

اس طرح کی چیزوں سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ عام لفظوں میں بات کہتے ہوئے بھی اس میں ایک جدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بات ہمیشہ سے بڑے شاعروں کی پہچان رہی ہے کہ وہ معمولی الفاظ سے غیر معمولی کام لیا کرتے تھے وہ چیز ہمیں یہاں بھی دکھائی دے رہی ہے۔

2.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: یہ غزل یگانہ کی مقبول غزلوں میں سے ایک ہے۔ جس کے مطلع میں ہی یگانہ نے اپنی فکری بلندی اور تخیل آفرینی کی چھاپ چھوڑنے کی ایک کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مطلع سوالیہ ہے کہ ادب نے دل کے نہ جانے کیسے کیسے تقاضوں کو اٹھا رکھا ہے۔ یہاں ''دل'' کلیدی لفظ ہے۔ اس لیے دل اور دل کے تقاضوں کو سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دل طرح طرح کے خیالوں کی آماجگاہ ہے۔ اس لیے تقاضے بھی گوناگوں نوعیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ یعنی خواہش، آرزوئیں، تمنائیں، ولولے، حوصلے، رنج وغم وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام کے تقاضوں کو ادب نے اٹھا رکھا ہے۔ یہاں ایک بات دونوں مصرعوں کے درمیان یہ محسوس ہوتی ہے کہ جس طرح سے ادب نے دل کے تقاضوں کو سنبھال رکھا ہے۔ اسی طرح گوناگوں شوق کے پہلوؤں کو ہوس نے دبا رکھا ہے۔ ہوس اور شوق کے معاملے کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہوس منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور شوق ہمیشہ مثبت پہلوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اب یہاں ایک نکتہ یہ ہے کہ انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ یہ کام کرے، وہ کام کرے، بھلائی اور نیکی کے کلام میں اپنا نام پیدا کرے لیکن ہوس اس کو بھلے کاموں سے روکتی ہے۔ انسان کے دل میں نہ جانے کیا کیا شوق ہوتے ہیں مگر جھوٹے عشق اور لالچ کی وجہ سے وہ نہیں کر پاتا۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ نہ جانے وہ کون کون سے شوق کے پہلو ہوں گے جن کو ہوس نے دبا رکھا ہے۔

دوسرا شعر: انسان اس فریب میں رہتا ہے کہ چھوڑو! یہ کام کل کر لیں گے، کیونکہ کل کتنی دور ہے ہی؟ اسی دھوکے نے، اسی کل کے دھوکے نے کہ کل کون سا بھاگا جا رہا ہے کون بہت دور ہے، کل تو کام ہو ہی جائے گا یا کر ہی لیں گے مگر اسی آج کل کے دھوکے میں نہ جانے کیسے کیسے اور کتنے قیمتی دن ہم نے گنوا دیے ہیں۔ اس شعر میں یگانہ

کبیر داس کے اس دوہے سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ''کل کرے سو آج کر، آج کرے سواب''، یعنی کل کا کام آج اور آج کا کام ابھی کرو ورنہ کل تو بہت دیر ہو جائے گی۔ شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان کو وقت کی قدر کرنی چاہیے۔ آج اور کل کے دھوکے میں پڑ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ نہ جانے کیسے کیسے لوگ تھے جنہوں نے اس آج کل کے چکر میں پڑ کر اپنا وقت گنوا دیا اور مایوسی ہاتھ لگی۔ اس لیے ہمیں اپنا کام کل پر ٹالنے کی بجائے فوراً کر لینا چاہیے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں ''تم'' کلیدی لفظ ہے، جس کا اشارہ خدائے تعالیٰ کی طرف ہے کہ اس دنیا میں فقیر اور بادشاہ نہ جانے کس کس رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ کسی ایک روپ میں ''تم'' بھی اپنا دیدار کرا دو۔ لفظ ''تم'' سے یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ یہ محبوب کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور اس سے کہا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بادشاہ اور فقیر بہت سے رنگوں میں موجود ہیں سو کسی ایک رنگ میں ''تم'' بھی اپنا جلوہ دکھا دو۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ ممکن ہے اور جیسا کہ شاہ و گدا کے رنگ لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس دنیا میں کیسے کیسے رنگ دکھلا رہے ہیں، کیسے کیسے جوہر، کیسی کسی کیفیتیں دکھلا رہے ہیں ایسے میں تم اگر حقیقی جوہر دکھلاتے تو کیا بات تھی؟

چوتھے شعر: اس شعر میں حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ پہاڑ کاٹنے والے زمین سے ہار گئے! یعنی وہ انسان جو سخت محنت اور جانفشانی کر کے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر جاری کرتا تھا وہ زمین سے ہار گیا؟ کیوں؟ کیسے؟ اس شعر میں یگانہ ''فرہاد'' کی تعریف کر رہے ہیں کہ اس کے اندر جو لگن تھی جو سچا جذبہ تھا اور جس کی بدولت وہ پہاڑ کاٹنے میں کامیاب ہوا تھا۔ آج کا انسان بھی وہی ہے اس طرح کا انسان ہے مگر، شاید اس کے اندر وہ تڑپ اور جذبہ نہیں ہے جو اس کے پاس تھا۔ ورنہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ پہاڑ کاٹنے والا انسان زمین سے ہار جائے۔ وہ انسان جو اپنے ارادے کا اتنا مضبوط تھا کہ پہاڑ کاٹ کر نہر جاری کر دیتا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے کہ وہ زمین سے ہار کر بیٹھ گیا ہے جب کہ اس زمین میں نہ جانے کیسے کیسے خزانے اور جواہر موجود ہیں۔ شعر کا مفہوم اب یہ ٹھہرا کہ انسان میں وہ لگن، وہ تڑپ، وہ جانفشانی کی قوت اور جذبے کی پختگی نہیں رہی کہ جو کبھی ہوا کرتی تھی اور جس کی بدولت انسان بڑے بڑے معرکہ سر

کرلیا کرتا تھا۔ ورنہ ہرگز ایسا ممکن نہیں تھا کہ پہاڑ کاٹنے والے زمین سے ہار جاتے۔

پانچواں شعر: اس پوری غزل میں جتنے مضامین باندھے گئے ہیں۔ سب کا مرکزی خیال انسانیت ہی ہے۔ اس شعر میں شاعر کا تخاطب تمام بنی آدم یعنی انسان سے ہے کہ آپ سب سے پہلے خود کو پست کاموں سے، خواہ وہ کسی نوع کے ہوں، باہر نکالیے اس کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس دنیا میں آ کر کیسے کیسے لوگوں کے پیر دنیاوی موہ مایا میں پھنس کر ڈگمگا گئے ہیں۔ انسان جب کسی کام میں ملوث رہتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ سب لوگ اسی طرح کی زندگی جی رہے ہیں، جیسی کہ وہ جی رہا ہے یعنی چور سارے جگ کو چور سمجھتا ہے۔ لیکن اگر انسان اپنے اندر وہ صفات پیدا کرے جو اعلیٰ اوصاف تسلیم کیے جاتے ہیں تب اس کو اس کی پستی کا اندازہ ہوگا کہ وہ کس کھائی میں پڑا ہوا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے بڑے بڑوں کے قدم اس دنیا میں ڈگمگائے ہیں۔

اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔ یہ صنعت اس وقت قائم ہوتی ہے جب شعر میں دو متضاد الفاظ استعمال کیے گئے ہوں یا یکجا ہو جائیں۔ اس شعر میں ''بلند'' اور ''پست'' کے درمیان صنعت تضاد قائم ہوتی ہے۔

چھٹواں شعر: اس شعر کو پڑھتے ہی ذہن غالب کے اس شعر کی طرف جاتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پیر داب تو دے

یگانہ کا یہ شعر بھی اسی رنگ کی یاد دلاتا ہے۔ یہ شعر خالص غزل کا شعر ہے اور عاشق اپنی لغزشوں کے باعث اپنے محبوب کے مسکرانے پر فدا ہوا جاتا ہے۔ لغزش کا مطلب ہے پھسلن، لرزش، کپکپی اور خطا، غلطی، بھول چوک۔ اب اگر شعر پر ایک بار پھر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ عاشق کے لڑکھڑانے پر اس کا معشوق جی بھر کر مسکرا رہا ہے۔ اس لیے وہ مارے خوشی کے اپنے قدموں کو چوم لینا چاہتا ہے کہ جس کے باعث اس کا محبوب یوں خندہ زن ہے۔ یہاں پر لفظ مسکرانا خاص توجہ کا طالب ہے کیونکہ اگر آدمی کھل کر ہنس دیتا ہے یا قہقہہ لگاتا ہے تو اس میں وہ کشش یا جاذبیت نہیں آتی جو مسکرانے میں پیدا ہوتی ہے۔ مسکراہٹ پر بے شمار اشعار ہمارے شعرا نے کہے ہیں۔

اس میں ایک پہلو یہ بھی ممکن ہے کہ عاشق محبوب سے گزارش کر رہا ہو یا کسی اور وجہ سے وہ اس کی باتوں پر کان نہ دے رہا ہو اور اب جب کہ اس کی لغزشوں کو وہ دیکھ کر دل کو موہ لینے والی مسکراہٹ سے جی بھر مسکرا رہا ہے تو ایسے میں اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ عاشق اسی کے صدقے جائے گا جس کی وجہ سے اس کا محبوب یوں مسکرا رہا ہے۔ اسی لیے عاشق خوشی میں چور ہو کر اپنے قدموں کو چوم لینے کی بات کہہ رہا ہے۔

ساتواں شعر: غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر خود اپنے آپ سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ ''میں کون ہوں''۔ ''کیا ہوں''۔ یہ مجھے نہیں معلوم' یہ بات صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کس طرح کا انسان ہوں۔ اپنی حرکات وسکنات اور اعمال دیکھ کر تو مجھے خود اپنی ذات پر نہ جانے کیسے کیسے شکوک وشبہات ہو رہے ہیں۔ یہاں' اس شعر میں بظاہر تو شاعر کا تخاطب خود اپنی ذات سے ہے لیکن ہم اگر اسے ذرا سا وسعت دے کر سمجھنے کی کوشش کریں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ انسان جس طرح کے کام اس دنیا میں کر رہا ہے' جس طرح کے اس کے اعمال ہیں' کیا اسے دیکھ کر ہم اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دے سکتے ہیں۔

ایک بات پر اور غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح آج کل انسان کا ظاہر اور باطن ہے اور جس قدر دونوں میں تضاد ہے۔ اس سے کیا کبھی ہم نکل پائیں گے۔ اس تضاد کو اگر ہم دیکھیں تو یقیناً ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس تضاد کو یا تو انسان خود جانتا ہے یا پھر خدا بہتر جانتا ہے۔ انسان اگر اپنے ظاہر اور باطن پر غور کرے تو اسے اپنے آپ پر ضرور شک ہوگا کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ جو ایسے ایسے کام کر رہا ہوں۔ اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ کون ہے؟ اس بات کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ ہمارے سوچنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم لاکھ غور و فکر کر لیں ہمارے بس میں کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ اس کا اصل معاملہ خدا ہی بہتر جانتا ہے اور بس۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

6. یگانہ کی پہلی غزل کا انتخاب کس مجموعۂ کلام کی کس اشاعت سے کیا گیا ہے؟

2.6 یگانہ کی دوسری غزل (2)

خودی کا نشہ چڑھا ' آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ ' مگر بنا نہ گیا
گناہِ زندہ دلی کہیے ' یا دل آزاری — کسی پہ ہنس لیے اتنا ' کہ پھر ہنسا نہ گیا
پکارتا رہا کس کس کو ؟ ڈوبنے والا — خدا تھے اتنے ' مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
سمجھتے کیا تھے ؟ مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
کرشن کا ہوں پجاری ' علی کا بندہ ہوں — یگانہ ! شان خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

2.6.1 مجموعی تاثر

یگانہ کی یہ غزل بھی آیات وجدانی سے لی گئی ہے۔ پہلی غزل ''آیات وجدانی'' طبع سوم میں شامل ہے۔ جب کہ مندرجہ بالا غزل ''آیات وجدانی'' طبع دوم میں شامل ہے لیکن طبع سوم میں اسے شامل نہیں کیا گیا ہے۔ پچھلی غزل کے ہی مانند اس غزل میں بھی غزل کے روایتی مضمون یعنی حسن و عشق' لب و رخسار' چشم و گیسو کی شاعری کے بجائے انسانیت اور اخلاقیات کے مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ اس غزل کے موضوعات سے ایسا لگتا ہے کہ یگانہ لب و رخسار کی جگہ انسانی قدروں کے مضامین کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انسانیت' اخلاقیات اور تہذیبی مضامین کثرت سے نظر آتے ہیں۔ یگانہ کی یہ بھی ایک یگانہ روی ہے کہ وہ اپنے خیالات و محسوسات کو بڑی آسانی سے بڑے سیدھے سادے لفظوں میں پیرو دیتے ہیں۔ اس غزل کا ایک نمایاں وصف یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے مطلع اور مقطع دونوں ہی میں اپنا تخلص نظم کیا ہے۔ لیکن دونوں کا انداز جداگانہ ہے' اس غزل کا حاصل غزل شعر ہے۔

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا — خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

اس شعر پر تفصیلی بحث تشریح کے دوران کی جائے گی۔ اس غزل کے پس منظر اور موضوعات کو اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اس غزل کا مرکزی خیال انسانی قدروں کے زوال پر مرکوز ہے۔

2.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: اس شعر میں سب سے پہلے خودی کو سمجھ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ''خودی'' کا مطلب ہے۔

انانیت، خود پرستی، غرور، تکبر اور خود شناسی۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے خود شناسی کا ایسا نشہ سوار ہوا کہ میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس کیفیت میں میں اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا یا مجھے اپنے آپ پر خدا کا گمان ہو چلا تھا مگر حقیقت میں ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ اب اس شعر کے موضوع کو ذرا سا پھیلا کر غور کریں تو حضرت انسان کی کہانی زیادہ سمجھ میں آئے گی۔ انسان اپنے آپ میں اتنا گم ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے لیکن انسان خواہ کتنی ہی کوششیں کرے مگر خاک کا پتلا خاک ہی رہے گا، خدا نہیں بن سکتا۔ اس شعر میں خود پرستی، غرور و تکبر جس سے کہ اکثر انسان متصف ہے اس پر طنز کیا گیا ہے کہ آپ کچھ بھی کر لیجیے مگر خدا بننا انسان کے بس کی بات نہیں ہے تو نہیں ہے۔ لہٰذا اس شعر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو انسان کی قدر کرنی چاہیے اور انسان بن کر جینے میں ہی عافیت ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں لفظ ''اتنا'' کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اس لیے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے جو کام کیا ہے اسے خواہ آپ میری زندہ دلی کہیں یا دل آزاری کی حرکت کہیں۔ یہ آپ پر ہے بہر حال گناہ تو مجھ سے ہو گیا لیکن اسی چھیڑ کا یہ نتیجہ ہے یا یوں کہیں کہ اسی سے ہمیں یہ سبق ملا کہ پھر زندگی بھر ہم نے ویسی حرکت نہیں کی۔ ''کسی پہ ہنس لیے اتنا''، یعنی حد سے زیادہ ہم نے کسی پہ ہنس لیا جس سے ہمیں یہ عبرت نصیب ہوئی کہ آدمی کو کسی پہ پھبتی نہیں کسنی چاہیے۔ انسان کو انسان سمجھنا ضروری ہے ورنہ ہم سے انسانیت کا جو تقاضا ہے اس کی بھرپائی نہیں ہو سکے گی۔ نتیجتاً ہم گناہ گار ٹھہریں گے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں یہ ضروری نہیں کہ کوئی انسان پانی میں ڈوب رہا تھا اور کسی نے اسے نہیں بچایا۔ ''خدا'' کا لفظ اس شعر میں استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہ بات بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص ڈوب رہا تھا اور اس نے بار بار لوگوں کو پکارا مگر کسی نے اس کی آواز پر لبیک نہیں کہا اور وہ غرقاب ہو گیا۔ مجھے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ اس شعر میں سماج کے نادار اور کمزور طبقوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ شخص جو مجبور ہے، لاچار ہے، ناتواں ہے، غریب ہے، نادار ہے کس کس کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کس کس کو آواز نہیں دیتا مگر یہ انسان جو خدا بننا چاہتا ہے تو یہ بات تو ناممکن ہے بلکہ اچھا انسان بن جائے یہی بڑی بات ہے۔ اس کے لیے بھی اپنے آپ کو خود ساختہ خدا جانتا ہے

اسے یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اس کی ذرا سی مدد کردے کہ وہ انسان اس پستی سے باہر آجائے کہ جہاں وہ ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہونی چاہیے کہ انسان خدا بننا چاہتا ہے تو اسے چند اچھی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جس میں بھوکوں کو کھانا کھلانا یا ضرورت مندوں کے کام آنا شامل ہے۔ اس بات کی طرف بہت ہی خوب اشارہ کیا ہے۔ ساتھ ہی انسانیت کا زبردست سبق بھی اس شعر میں مضمر ہے۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ جب ہماری سمجھ میں درد و دکھ کی باتیں نہیں آتی تھیں تب ہم درد کے ترانے سن لیا کرتے تھے لیکن جب سے سمجھ میں آنے لگا ہے تب سے ہم سے سنا نہیں جاتا۔ ترانۂ درد جب نہیں سمجھتے تھے تب سنا کرتے تھے۔ لیکن اب جب کہ سمجھ میں آنے لگا ہے تب سے ہم سے سنا نہیں جاتا۔ یعنی شاعر کا دل اتنا نرم و نازک ہے کہ اس سے دوسروں کا دکھ برداشت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے شاید اب وہ کوئی نالہ و فریاد نہیں سن پاتا ہے

پانچواں شعر: اس شعر میں یگانہ مذہبی رواداری کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔ علی اور کرشن کا استعمال بطور علامت ہوا ہے جس میں ایک سے مراد اسلام ہے تو دوسرے سے مراد ہندو مذہب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر میں مذہبی کٹرپن نہیں ہے اسے جہاں بھی خدا کی شان دکھائی دیتی ہے وہاں وہ اپنا سر تسلیم خم کردیتا ہے۔ یہاں ایک بات اور ذہن میں رکھنے کی ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ہر فرقے میں ایک پیغمبر اتارا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کرشن بھی انہیں میں سے ایک ہوں، اس لیے میں ان کی تعلیمات کو بھی مانتا ہوں اور مسلمان تو میں ہوں ہی کہتے ہیں کہ خدا ذرے ذرے میں موجود ہے تو پھر کیا عجب ہے کہ ہمیں جہاں خدا کی شان نظر آئے وہاں ہمارا سر نہ جھکے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

7. صنعت تضاد کب قائم ہوتی ہے؟
8. یگانہ اپنی شاعری میں کن موضوعات کو ترجیح دیتے ہیں؟
9. خودی کے معنی بتایئے۔

2.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے اردو شاعری کے ایک ممتاز شاعر یگانہ کی حیات اور غزل گوئی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ان کے تعلیمی کوائف' زندگی کے چڑھاؤ اتار' ملازمت کے سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں گردش وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ یہاں اس اکائی میں یگانہ کی غزلیات ورباعی کا بھی ذکر کیا گیا تا کہ طلبہ ان کی شاعری سے پوری طرح آگاہ ہوسکیں۔ ان کی شاعری میں انسانیت' اخلاقی قدریں اور آدمی کے جملہ محرکات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے غالب کے مقابلے میں آتش کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لیے سخت مضامین لکھے۔ اہل لکھنؤ سے الگ اپنی ایک روش قائم کرنے کے لیے ''غالب شکن'' اور ''آتش پرست'' جیسے القاب اختیار کیے۔ ان تمام کا احاطہ خاطر خواہ حد تک اس اکائی میں کر دیا گیا ہے۔ آپ کے خصوصی مطالعے کے لیے دو غزلیں' ان کی تشریح اور ان کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ پہلی غزل کے الفاظ انتہائی سادہ اور عام فہم ہیں مگر معانی انتہائی وسیع اور گہرے۔ خصوصاً اس غزل کا استفہامیہ لہجہ تاثر میں بے پناہ اضافہ کرتا ہے۔

دوسری غزل روایتی غزلیہ علامات' تشبیہات اور استعارات کی حامل ہونے کے باوجود انسانی قدروں کے تعلق سے چند خیالات اپنے اندر رکھتی ہے۔ یگانہ کی یہ غزل حکایات زلف ورخسار نہیں سناتی بلکہ انسانیت اور اخلاقی قدروں سے واقف کراتی ہے۔ یگانہ سے متعلق مزید مطالعے کے لیے کتابوں کی فہرست بھی آگے دی گئی ہے۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی آپ کی سہولت کے لیے اکائی میں شامل ہے۔ اکائی کے مطالعے کے بعد یگانہ کی شاعری سے آپ کو یقیناً دلچسپی پیدا ہوگی اور آپ کتابیات سے ضرور استفادہ کریں گے۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 یگانہ چنگیزی کی تخلیقات کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کیجیے۔

2 ''غالب شکن'' اور ''آتش پرست'' بننے کی کیا وجوہ تھیں؟ بیان کیجیے۔

3 یگانہ کی تعلیم اور ملازمت سے واقف کرائیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 یگانہ چنگیزی کی مختصر سوانح حیات تحریر کیجیے۔

2. یگانہ کی شاعری میں انسانیت کے موضوعات کی نشاندہی کیجیے۔

3. اہل لکھنو سے ان کی معرکہ آرائیوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

2.9 فرہنگ

اغراض	غرض کی جمع، مطلب، ضرورت	ناگزیر	ضروری، لازم جس سے فرار نہ ہو
مقاصد	مقصد کی جمع، منشا، نیت، ارادہ	بخوبی	اچھی طرح، پوری طرح
تقلیدی	نقل کیا ہوا، نقلی	اجمالی	مختصر
معرکہ آرائی	لڑائی، جنگ، صف آرائی	منفرد	تنہا، اکیلا، یکتا، واحد
مراسم	تعلقات، برتاؤ	اجداد	جد کی جمع، باپ دادا، پرکھے
حتمی	پکا، مضبوط	سلطنت	حکومت، بادشاہی
تلخ	کڑوا، ترش، تیز	بالیدگی	بڑھوتری، افزائش، اضافہ
شاہ و گدا	بادشاہ اور فقیر، امیر اور غریب	شیوہ	طور، ڈھنگ، انداز
بندش	حسب موقع اور ترتیب کے ساتھ، گرہ	مفہوم	سمجھا گیا، جو سمجھ میں آئے
مستحو دسر	سرکش، ضدی	عبث	بے کار، بے فائدہ، فضول، ناحق
عافیت	امن، سلامتی، آسودگی، صحت، خیریت	گوناگوں	طرح طرح کا، رنگ برنگا

ردیف وہ لفظ جو غزل و قصیدے کے ہر شعر کے آخر میں قافیے کے پیچھے بار بار آئے۔

تخلص شاعر کا وہ مختصر نام جو اشعار میں استعمال کیا جاتا ہے۔

تخیل وہ قوت جو خیالی صورتیں بنائے، تصور، قیاس

2.10 معاون کتابیں

1. مشفق خواجہ ، کلیات یگانہ چنگیزی، میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی 2003

2. مشفق خواجہ، پاشا رحمان، آمنہ مشفق ، میرزا یگانہ شخصیت اور فن، آصف پبلی کیشنز، علی گڑھ 1992ء

3. اعجاز حسن تاریخ ادب اردو، سن اشاعت ندارد

4. سیدہ جعفر تاریخ ادب اردو: عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک (جلد چہارم) حیدر آباد

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. مرزا واجد حسین

2. ان کی پیدائش 17 اکتوبر 1884ء کو پٹنہ میں ہوئی۔

3. ان کے شعری مجموعوں کے نام ہیں: نشتر یاس، آیات وجدانی، ترانہ اور گنجینہ

4. یگانہ نے 21-1920ء میں اپنا تخلص یاس سے یگانہ کرلیا تھا۔

5. یگانہ کی شاعری میں انسانیت اور اخلاقی اقدار مرکزی موضوعات ہیں۔

6. یگانہ کی پہلی غزل کا انتخاب آیات وجدانی کی تیسری اشاعت سے کیا گیا ہے۔

7. جب شعر میں دو متضاد الفاظ یکجا ہو جائیں تو صنعت تضاد قائم ہوتی ہے۔

8. اخلاقی اقدار اور انسانیت

9. خودی کے معنی ہیں انانیت، خود پرستی، غرور، تکبر اور خود شناسی

اکائی 3: شادؔ عظیم آبادی

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 شادؔ عظیم آبادی: حیات

3.4 شاد کی شاعرانہ خصوصیات

3.5 شاد کی غزل (1)

3.5.1 مجموعی تاثر

3.5.2 اشعار کی تشریح

3.6 شاد کی غزل (2)

3.6.1 مجموعی تاثر

3.6.2 اشعار کی تشریح

3.7 خلاصہ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.9 فرہنگ

3.10 معاون کتابیں

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں شادؔ عظیم آبادی کی شخصیت' حیات اور کارناموں پر مختصر لیکن جامع' ڈھنگ سے روشنی ڈالی

جائے گی تا کہ آپ ان کی شخصیت سے واقف ہوسکیں۔ شاد کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات سے بھی بحث کی جائے گی۔ آپ کے خصوصی مطالعے کے لیے ان کی دو اہم غزلیں بھی شامل ہیں، جن کے تمام اشعار کی تشریح آسان زبان میں کی جائے گی۔ ساتھ ہی مجموعی تاثر اور خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد توقع ہے کہ آپ شاد کی زندگی اور شاعری سے پوری طرح واقف ہو جائیں گے۔

3.2 تمہید

شاد عظیم آبادی کا شمار اردو کے کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نثر اور نظم میں پچاسوں کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جن سے ان کی گوناگوں خوبیوں کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاد اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ انہوں نے اردو شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شخصیت کا اصل جوہر غزلوں ہی میں کھلتا ہے۔ شاد کا شعری لہجہ منفرد بھی ہے اور موثر بھی۔ ان کی شاعری ایک طرف دبستان لکھنؤ سے کسب فیض کرتی ہے تو دوسری طرف دبستان دہلی کی شعری خصوصیات بھی اپناتی ہے۔ وہ اگر قدیم شعری لہجے کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں تو اپنے دور کے جدید طرز اظہار سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔

3.3 شاد عظیم آبادی: حیات

شاد کا اصل نام علی محمد، تخلص شاد تھا۔ ان کی ولادت 8 جنوری 1846ء کو نانا کے مکان واقع پورب دروازہ، شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوئی تھی۔ انھیں اپنے شہر سے بے حد لگاؤ تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے شہر کا نام بھی منسلک کرلیا۔ شاد کے والد کا نام سید اظہار حسین عرف عباس مرزا تھا۔ جو الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ عظیم آباد چلے آئے جہاں شاد پیدا ہوئے۔ شاد کی تعلیم کا سلسلہ چار برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ ان کے اساتذہ میں سید فرحت حسین، سید رمضان علی، شیخ برکت اللہ، شیخ آغا جان اور حاجی محمد رضا جیسے نامور لوگوں کا نام شامل ہے۔ حالانکہ خود شاد نے اپنے استاد کا نام سید شاہ الفت حسین فریاد تحریر کیا ہے۔

شاد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ عربی فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصے تک انگریزی بھی

پڑھی۔ اپنی ذاتی لیاقت اور لائق اساتذہ کی تربیت سے اردو، عربی اور فارسی نیز مذہبی علوم اور فن شعر میں ایسی مہارت حاصل کی کہ ان کا شمار دور جدید کے اہل علم شعرا میں ہوتا ہے۔ علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ انہوں نے عیسائیوں، پارسیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ جس سے ان کی علمیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ابتدا میں شاد نے کلام پر اصلاح دو لوگوں سے لی، جن کے نام ناظر وزیری عبرتی اور مولانا میر تصدق حسین زخمی ہیں۔ ادبیات اور فنونِ شاعری کی بیشتر کتابیں انھیں دو بزرگوں سے پڑھیں لیکن اس کی تکمیل شاہ الفت حسین فریاد سے ہوئی جو خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ شاد نے اپنی پوری عمر ادب کی خدمت میں گزاری تقریباً 60 تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی علمی خدمات کا صلہ گورنمنٹ کی طرف سے بھی ملتا رہا۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 1891ء میں خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ ساتھ ہی انھیں سرکار سے ایک ہزار روپے سالانہ وظیفہ بھی ملتا رہا۔

شاد کا قد درمیانہ، اکہرا جسم، موزوں وضع قطع اور رنگ صاف تھا۔ لباس میں شیروانی یا ترکی کوٹ، ایرانی ٹوپی اور انگریزی بوٹ پہنتے تھے۔ انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی 1862ء میں کلثوم فاطمہ بنت میر آغا جان سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادے سید حسین 1880ء میں پیدا ہوئے اور اسی دن ماں نے اس سرائے فانی سے کوچ کیا۔ شاد کی دوسری شادی 1886ء میں زہرہ بیگم سے ہوئی۔ اس بیوی سے ایک لڑکی آمنہ پیدا ہوئیں۔ انھیں دو اولادوں سے شاد کا خاندان پھولا پھلا اور آگے بڑھا۔

شاد سیر و سیاحت کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ہندستان کے شہروں کے دورے کیے۔ مثلاً کلکتہ، مرشد آباد، لکھنؤ، علی گڑھ، دار جلنگ، کانپور اور جونپور اس کے علاوہ نظام حیدر آباد کی دعوت پر حیدر آباد جانے کی آرزو تھی جو کسی وجہ سے پوری نہ ہو سکی۔

اپنی ذاتی جائیداد کے علاوہ حکومت کی جانب سے بھی ایک ہزار سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔ 17 سال تک آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز رہے اور 14 برس تک میونسپل کمشنر کے عہدے پر بھی کام کیا۔ ان سب کے باوجود زندگی کے آخری ایام میں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار اردو کا یہ روشن چراغ 7 جنوری 1927ء کو عالم اجسام سے

عالم ارواح کو منتقل ہو گیا۔

شاد نے نثر و نظم میں کل ملا کر تقریباً ساٹھ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر طبع ہو چکی ہیں۔ کلیات شاد تین حصوں میں اردو کے نامور ناقد کلیم الدین احمد نے ترتیب دے کر 1978ء میں شائع کیا ہے۔ اس سے قبل انتخاب کلام شاد مرتبہ حسرت موہانی 1909ء ریاض عمر 1914ء کلام شاد مرتبہ قاضی عبدالودود۔ 1922ء میخانہ الہام مرتبہ حمید عظیم آبادی۔ 1938ء سروش ہستی مرتب نقی احمد ارشاد۔ 1956ء فروغ ہستی مرتب نقی احمد ارشاد 1958ء قطعات شاد مرتب فاطمہ بیگم۔ 1964ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے کئی اور مجموعے ہیں۔ جن میں مراثی شاد دو جلدیں مرتب نقی احمد ارشاد۔ 1952ء رباعیات شاد، تہنیت نامے، طلسم کدہ دنیا، ثمرۂ زندگی، فغان دلکش اور مادر ہند جیسی بہت سی تخلیقات ابھی بھی طباعت کی راہ دیکھ رہی ہیں۔

ابھی تک ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ سبھی شاعری سے متعلق تھیں۔ شاد نے شعری میدان کے ساتھ ساتھ نثر میں تقریباً 24 کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے بعض ابھی طباعت کی منتظر ہیں۔ نثری تصانیف میں تاریخ بہار 1875ء اور 1891ء میں یعنی دو بار شائع ہو چکی ہیں۔ نقش پائے دار تین جلدوں میں علی الترتیب 1927,1924 اور 1928ء میں منظر عام پر آئی۔ ان کی نثری تصانیف میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا 24 میں سے صرف آٹھ ہی شائع ہوئی ہیں باقی ماندہ کے نام حیات فریاد، صورت الخیال، اردو تعلیم، صورت حال، مردم دیدہ، نوائے وطن، فارسی تعلیم، ذخیرۃ الادب، کشکول، فکر بلیغ اور الصرف النحو، المنطق وغیرہ ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. شاد کا اصلی نام کیا تھا اور وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. شاد کی تین شعری تخلیقات کے نام لکھیے۔
3. شاد کن کن عہدوں پر فائز رہے؟

3.4 شاد کی شاعرانہ خصوصیات

شاد نے جیسا کہ پچھلے صفات میں عرض کیا گیا مثنوی' غزل' قیصدہ' مرثیہ اور دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن' ان کی شہرت کا اصل سبب ان کی غزلیں ہیں جو سادگی' گھلاوٹ' ترنم وشیریں کیف وسرور اور تاثیر اور اثر کی بدولت لائق توجہ ہیں۔ ان کے کلام کی سب سے ممتاز خوبی ان کی زبان کی صفائی اور سادگی ہے۔ نہایت شیریں اور منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں جو فوراً دل ودماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ شاد کے زمانے میں غزل کا زور ذرا کم ہونے لگا تھا۔ انہوں نے بھی غزل کی پلکیں سنوارنے میں خاص کردار ادا کیا اور اپنے منفرد لب ولہجے میں اسے ایک توانائی عطا کی۔ واردات قلبی کے ساتھ ہی ساتھ اخلاق' فلسفہ اور توحید ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں حمد' نعت اور منقبت کے مضامین کو اس طرح سے پرویا ہے کہ ان سے ان کی غزلوں کو ایک نئی معنویت حاصل ہوگئی۔ شاد کے بعض اشعار کی تفہیم کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان کے مذہبی تناظر اور ان احادیث سے واقفیت نہ ہو جن سے شعر میں استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کی بہت سے شعر اسی خصوصیت کے حامل ہیں۔ انھیں اسلامی پس منظر میں پیش کرتے ہوئے غزل کی علامتوں سے مذہبی تصورات کی آئینہ داری کا کام لیا گیا ہے۔

خرابات میں مے کشو آ کے چن لو — نبی اپنا اپنا امام اپنا اپنا

سبو کے آتے ہی اللہ رے خوشی اے مست — امام آئے رسول آئے خدا آیا

لب پہ آیا نام ادھر اور مست گرنے سے بچا — یہ تو ادنیٰ معجزہ ساقی کے میخانوں میں تھا

ساقیِ مہ لقا نے جب خم سے سبو میں ڈال دی — مجلس مئے میں چار سو شور اٹھا درود کا

ان اشعار میں اگر ایک طرف خمریاتی شاعری کے موضوعات اور غزل کی علامتوں کی لچکداری اور نئے مفہوم کی ترجمانی سے کام لیا گیا تو دوسری طرف ان کا سلسلہ صنف مرثیہ کے ساقی نامہ سے استوار نظر آتا ہے۔ ''ساقی نامہ'' کا بنیادی تصور آنحضرت ﷺ اور خانوادۂ رسالت کی محبت کو شراب طہور کے تصور سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ اس شرابِ پاکیزہ کی تعریف دیکھیے:

یہ قدرت سے بنی عرش کے میخانے میں　　جو جھلکتی رہی قرآن کے پیمانے میں
نوح و اصحاب بہم جس کے سہارے پہنچے　　جس کا ڈوبا ہوا کوثر کے کنارے پہنچے

ایک بند ملاحظہ ہو:

شعلہ نار و سقر سے جو بچالے وہ شراب　　حشر میں گرتے ہوؤں کو جو سنبھالے وہ شراب
آگ کی طرح گناہوں کو جو کھالے وہ شراب　　اپنی پاکی پہ جو قرآن اٹھالے وہ شراب
جس کی قوت سے جوانی فلک پیر میں ہے
جس کی منزل قدح آئینہ تطہیر میں ہے

غزل کے دیگر شعرا کی طرح شاد نے بھی اسلامی تاریخ اور واقعات پر بلیغ اشارے کیے ہیں جس کی مثالیں ان کے کلام سے بہ آسانی فراہم ہو جاتی ہیں۔ اس کے سمجھنے کے لیے ہمیں اسلامی تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے:

اللہ اللہ شکر کا کلمہ نہ بھولا مر کے بھی　　سر کٹا پر لب تیرے بسمل کا جناں رہ گیا
بخشوادیں گے ہم اوروں کے بھی اے شاد قصور　　جدا علی ہے شہنشاہ دو عالم اپنا
گردن میں طوق ہو کہ سلاسل میں ہو قدم　　آزاد ہر طرح ہے گرفتار آپ کا
الٹا نہ عراق و شام و حلب دنیا نہ ہوئی ویران تو کیا　　جل تھل نہ لہو سے تو نے بھرا اے خونِ مسلماں کچھ نہ کیا

شہنشاہ دو عالم سے مراد حضور پاک ﷺ ہیں پہلے اور تیسرے شعر میں واقعات کربلا کی طرف اشارہ ہے۔ شاد کے یہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بھی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایک بات کا یہاں عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صوفیانہ طرز کے باوجود شاد کے یہاں حمدیہ رویہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اسے اللہ کی قدرت کا کرشمہ تصور کرتے ہیں کہ اس کا جلوہ ذرے ذرے میں نمایاں ہیں:

جہاں پہنچے اسی کا نور پایا　　جدھر دیکھا وہی خورشید رو تھا
جس طرف جاتی نظر اپنا ہی جلوہ تھا عیاں　　میں نہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

مہک اٹھا چمن دہر کا پتہ پتہ　　راز چھپنے نہیں دیتی تیری خوشبو تیرا

عشق ہے عالم امکاں کو محیط اے پیراک　　ڈھونڈتا پھرتا ہے گھبرا کے کنارہ کس کا

غزل کے بنیادی موضوعات عشق و محبت کی باتیں کرنا ہے۔ ان موضوعات میں بھی شاد نے اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ ان کا عشق والہانہ ہے اور اس میں وہ بڑی بے باکی سے کہتے ہیں:

ویران کیجیے کہ دلوں کو بسایئے

مئے کش تمام آپ کے میخانہ آپ کا

شاد کا عشق، عشق کا بہت پاس رکھتا ہے۔ انہیں اس تجاہل عارفانہ سے بھی آگاہی ہے۔ جو دلوں کو ویران تو کرتا ہے مگر ذہن سے یادوں کو نہیں مٹاتا۔ اس لیے کسی کی یاد شاد کے یہاں نگاہ ناز کی برچھی تو بنتی ہے لیکن وہ اس راز سے بھی واقف ہیں کہ نیا فسوں ساز نئے انداز کے ساتھ آیا ہے۔ وہ شکوہ و شکایت اپنے محبوب سے نہیں کرتے بلکہ اپنے جذبوں کو کچھ یوں ادا کرتے ہیں:

پوچھو نہ حال چشم دل آویز یار کا　　کھولو نہ راز گردش لیل و نہار کا

پاس ناموس عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میں تو درد و غم و اندوہ کا پتلا ٹھہرا　　بھول جاتا تجھے پر تو تو نہ بھولا ہوتا

شاد کا عشق اس بنیادی انسانی فطرت سے تعلق رکھتا ہے جہاں جنس ایک مسلم قوت کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ شاد کی عشقیہ غزلیں اپنے اندر اس رس کی کیفیت رکھتی ہیں جو ہندوستانی نظریات کی پہچان ہیں:

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا　　چشمۂ تر تو نے مجھ کو کھو دیا

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینہ اسی کا ہے　　ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

تجھ سے مایوس ہزاروں ہیں تصدق تجھ پر　　تو سلامت رہے تجھ سے ہے تمنا باقی

ساقی کی چشم مست پہ مشکل نہیں نگاہ　　مشکل سنبھالنا ہے دل بے قرار کا

اوپر درج کیے گئے اشعار سے ایک خاص طرح کی سوچ، ذہنی پختگی اور سنجیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شاد کے یہاں ان کا ایک اور رنگ ہے جسے ہم بے حد دل آویز کہہ سکتے ہیں:

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں، تنگ قبائیں اف ری جوانی ہائے زمانے
اپنی ہوا سے آپ جھجکنا، اپنی ادا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش، منھ پہ حیائیں، اف ری جوانی ہائے زمانے
کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں، اف ری جوانی ہائے زمانے
پچھلے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں، ناک رگڑنی، سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے
شاد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے

یہ پوری غزل اپنا منفرد لب ولہجہ رکھتی ہے۔ شاد کا عشق اسی دنیا کا عشق ہے۔ اسی مادی و فانی دنیا کا عشق ہے۔ جی ہاں لیکن ان کے عشق میں ایک طرح کی طرح داری پائی جاتی ہے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ یہ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ عشق کی محفل اسی طرح رنگ برنگی اور پرکشش بنی رہے گی۔ شاید اسی لیے انہوں نے کہا تھا:

نت نئے کھیل زمانے کو نظر آئیں گے
جب تک اس خاک پہ ہے خاک کا پتلا باقی

شاد کی غزلوں سے ان کے ذہن کی پختگی، مزاج کی شائستگی اور طرز فکر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اب تک ہم نے جتنی مثالیں شاد کے کلام سے پیش کی ہیں اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شاد نے عشقیہ مضامین بھی باندھے

ہیں، تجربات عشق کی مصوری بھی کی ہے اور محبوب کی پیکر تراشی بھی کی ہے لیکن اپنا ایک معیار قائم رکھا ہے۔ کہیں بھی کوئی بات اعتدال سے ہٹ کر نہیں کی ہے۔ انہوں نے اپنا ایک معیار بنائے رکھا اور کلام میں ایک سنجیدگی کی فضا ہمیشہ قائم رکھی۔ شاد کے چند ایسے شعر جو مادی محبت اور عشق مجازی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ بہ خوبی ہو جائے گا کہ ان کا عشق ایک مہذب شخص کا تجربۂ حیات ہے جس میں چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ پوری طرح موجود ہے:

جو مسکرا کے نظر کی تو جی گئے قاتل — نگاہ پھر جو چرائی تو قتل عام کیا

سوچتا ہوں کہ جب آئے گی میری یاد تجھے — کون پونچھے گا ڈھلکتا ہوا آنسو تیرا

وہ بزم غیر میں ہر بار اضطراب میرا — بہ مصلحت وہ تیرا سر جھکا کے رہ جانا

ایک بات اور جس کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے وہ ہے ان کی زبان۔ اپنی زبان کو انہوں نے کبھی بھی دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں مقید نہیں کیا۔ البتہ دونوں سے زبان کی ہمواری، محاوروں کے استعمال، روزمرہ کی برجستگی، لفظوں کے دروبست اور ان کی معنوی قدر و قیمت سے استفادہ ضرور کیا۔ شاد صنائع و بدائع کے استعمال کو بہت اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہاں کہیں کہیں رعایت لفظی سے کام لیتے تھے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. شہنشاہ دو عالم سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
5. شاد کے کلام سے وحدت الوجود کی ایک مثال پیش کیجیے۔
6. شاد کی زبان پر کس دبستان کا رنگ دکھائی دیتا ہے؟

3.5 شاد کی غزل (1)

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں — کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ — ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں

دل مضطر سے پوچھ ' اے رونق بزم! میں خود آیا نہیں ' لایا گیا ہوں
نہیں اٹھتے قدم کیوں جانب دیر؟ کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجاز مئے کا بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں
کجا میں ' اور کجا اے شاد! دنیا کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

3.5.1 مجموعی تاثر

غزل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق ایک خاص رنگ میں ہوئی۔ عموماً غزل میں شعر الگ الگ رنگ اور خیال کے ہوتے ہیں لیکن اس غزل کے تمام شعر ایک ہی خیال پر مرکوز دکھائی دیتے ہیں۔ میرے خیال سے اس غزل کا عنوان بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ غزل شاد کی بے حد مقبول غزلوں میں سے ایک ہے۔ بالخصوص پہلا شعر تو زبان زد خاص و عام ہے۔ پوری غزل کی زبان بالکل سادہ اور عام فہم ہے لیکن معنوی سطح پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ شاد نے معمولی الفاظ سے غیر معمولی کام لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ شاد کی غزلوں میں محبوب سے تخاطب کا بھی ایک معیار ہے۔ اسی طرح کا ذکر اس غزل میں بھی ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ غزل نہایت کامیاب غزل ہے۔ اس سے شاعر کے ذہن' رویے' لہجے اور تخیل و تصور کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

3.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: اس دنیا میں انسان کا جو حال ہے۔ اس کا بیان نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔ انسان خواہ کوئی بھی ہو' اس کے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں' امیدیں اور تمنائیں ہوتی ہیں اور انھیں کی ادھیڑ بن میں انسان ساری زندگی لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخری گھڑی آجاتی ہے۔ اس شعر میں شاد نے ان آرزوؤں کو کھلونا کہا ہے یعنی یہ ایک طرح کا کھلونا ہیں۔ جن سے انسان کا دل بہل جاتا ہے۔ اس میں ایک بات یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان دنیاوی چیزوں میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ زندگی کا اصل مقصد ہی بھول جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کا اصل مقصد عبادت کرنا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے جب کہ انسان ایک بار جب دنیا میں آجاتا ہے تو پھر اسی کے چکر میں لگا رہتا ہے۔ یعنی انسانی خواہشیں

ہمیں غافل کر دیتی ہیں اور آدمی اسی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی ممکن ہے کہ محبوب نے بار بار وعدہ کیا ہو اور ہر بار وعدے سے مکر گیا ہو، جس کا ذکر شاعر یہاں کرنا چاہ رہا ہے کہ جب جب اس نے وصال کا وعدہ کیا، تب تب اس کی تمنائیں جوان ہوئیں اور انہیں تمناؤں میں وہ الجھ کر رہ گیا اور اس کے محبوب نے اسے اسی میں بہلا پھسلا کر رکھا۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شادؔ اپنے محبوب کے کوچے کا ذکر کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں کلیدی لفظ ''ذرہ'' ہے۔ یعنی عاشق نے اپنے محبوب کی گلی کا اس قدر چکر لگایا ہے کہ ایک ایک ذرے سے واقف ہو گیا ہے لیکن اب عالم دوسرا ہے۔ اس قدر محبوب کی گلیوں کی خاک چھاننے کے بعد بھی وہ رضامند نہ ہوا لہٰذا عاشق ناامید ہو کر بیٹھا رہا۔ شعر کے لہجے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاشق کسی سے کہہ رہا ہے کہ مجھ سے اس گلی کے بارے میں مت پوچھو، کیونکہ میں اس گلی کے ایک ایک ذرے سے واقف ہوں۔ اس لیے کہ میں اس گلی سے ایک طویل مدت تک گزرتا رہا ہوں۔ اگر یہ تخاطب رقیب سے ہے تو یہ سمجھ لینا مشکل نہیں کہ عاشق کے ایسا کہنے سے وہ دل برداشتہ ہو جائے گا اور عاشق کی مراد پوری ہو جائے گی۔

تیسرا شعر: اس شعر میں ''رونق بزم'' محبوب کا استعارہ ہے۔ شعر کے پس منظر سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے عاشق اپنے محبوب کی محفل میں آ پہنچا ہے اور اسے دیکھ کر محبوب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں کہ رازِ محبت فاش نہ ہو جائے۔ محبوب کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر اپنی بات کہتے ہوئے عاشق کہتا ہے کہ اپنے دل مضطر سے پوچھو! بجائے اس کے حیرت میں پڑ دیا مجھ سے سوال کرو۔ کیونکہ میں یہاں خود سے یا اپنے آپ نہیں آیا ہوں بلکہ مجھے یہاں لایا گیا ہے۔

چوتھا شعر: اس شعر میں سب سے پہلے اس کا سہل ممتنع ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ پہلے مصرعے کو اگر نثر میں تبدیل کریں تو اس کو یوں کہیں گے ''میرے قدم بت خانے کی طرف کیوں نہیں اٹھتے'' دوسرے میں مصرعے میں اس کا جواب دیا ہے کہ ''کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں'' اس شعر میں مذہبی انتہا پسندی یا کٹر پن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

۔یعنی اگر میں کسی بت خانے کی طرف نہیں جاتا یا میرے قدم بت خانے کی طرف نہیں اٹھ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری مذہبی انتہا پسندی ہمیں ایسا کرنے سے روکتی ہے۔

ایک اور پہلو اس شعر میں یہ ممکن ہے کہ ہندو مذہب بھی وحدانیت کا قائل ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ بت پرستی کے ذریعے عبادت کرنا سکھاتا ہے۔اس کے علاوہ مذہبی رواداری' بھائی چارہ' آپسی پیار' امن کا پیغام' ہندو مذہب بھی دیتا ہے۔ ہمارا مذہبی کٹر پن ہمیں ایک حصار میں رہنے کو مجبور کرتا ہے ورنہ اچھائیاں تو ہندو مذہب میں بھی ہیں ہمیں وہاں سے بھی اچھائی اور بھلائی کا سبق لینے میں کوئی عذر نہیں کرنا چاہیے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں اعجاز مئے سے مراد شراب کے کرشمے سے ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ شراب کا کرشمہ بے خودی ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میں شراب کے کرشمے کا قائل نہیں تھا لیکن بڑی مشکلوں سے مجھے یہ منوایا گیا ہے کہ شراب میں کرشمہ ہوتا ہے۔شراب سے آدمی خود کو بھول جاتا ہے اور بے خودی کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔

چھٹواں شعر: اس شعر میں شاعر خود اپنے آپ سے مخاطب ہے کہ کہاں میں؟ اور کہاں اے شاد! یہ دنیا میں کہاں سے کس جگہ آ گیا ہوں۔اس شعر کو ذرا اور آسان کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کہاں میں؟ اور کہاں یہ دنیا؟ مگر ہائے ری قسمت کہاں سے کس جگہ آ گیا' افسوس! صد افسوس۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7.. ''رونق بزم'' کی ترکیب شاعر نے کس کے لیے استعمال کی ہے؟

8. چوتھے شعر کی کون سی خصوصیت ہمیں سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے؟

3.6 شاد کی غزل (2)

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے' سینہ اسی کا ہے ہمارا آپ کا جینہ نہیں' جینا اسی کا ہے

یہ بزمِ مئے ہے' یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں' مینا اسی کا ہے

مکور یا مصفا، جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں حقیقت میں وہی مئے خوار ہے، پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے، طلسمی سانپ ہیں زاہد! جو توڑے یہ طلسم اے دوست! گنجینا اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد! پیری میں کہ جس کو منھ دکھانا ہے، یہ آئینہ اسی کا ہے

3.6.1 مجموعی تاثر

پوری غزل نہایت رواں، سبک اور آسان زبان میں ہے۔ صرف ''مکدر یا مصفا'' کو اگر چھوڑ دیا جائے تو ایک بھی لفظ ایسا نہیں کہ جس کے معنی عام فہم نہ ہوں۔ یہ شاد عظیم آبادی کا خاص رنگ ہے۔ اس غزل کو پڑھتے ہی میر تقی میر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسی طرح عام اور روزمرہ کے لفظوں سے میؔر نے بھی بڑا کام لیا ہے۔ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ محبوب کا ذکر ہے، شراب کا ذکر ہے لیکن جس طرح بداعت اسلوب (پرانے مضمون کو نئے لفظی پیکر میں پیش کرنا) سے کام لے کر شاعر نے دادِ سخن لینے کی کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اس دنیا میں زیادہ تر لوگ اپنے شوق، اپنی آرزو اور خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہیں لیکن حقیقت میں اسے میں کوئی لطف نہیں آتا ہے۔ لہذا انسان کو بغیر بغض و کینہ کے زندگی گزارنا چاہیے کیونکہ ہمیں جس کو منھ دکھانا ہے۔ ہمارا دل اس کا آئینہ ہے۔

3.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: شاعر کہتا ہے کہ حقیقت میں جینے کا مزہ اسی کو حاصل ہے جس کو کہ نگاہوں کی برچھیاں سہ لینے کی ہمت ہو۔ بھالا، برچھی اور تیر ان کا وار ہمیشہ سینے پر ہی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کا وار سہنے کے لیے سینہ مضبوط ہونا چاہیے۔ حقیقی بھالے یا برچھی سے زیادہ طاقت ور وار نگاہوں کی برچھیوں کا ہوتا ہے۔ اسی لیے شاد کہتے ہیں کہ جو شخص نگاہوں کی برچھیاں سہہ لے حقیقت میں وہی مرد ہے یا اسی کا سینہ سینہ ہے، جو اس طرح کے وار سہہ کر بھی زندہ ہے اسی لیے حقیقی جینا بھی اسی کا ہے۔ ہمارا آپ کا نہیں۔

دوسرا شعر: یہ مئے خانہ ہے، اس لیے یہاں سوچنے یا لحاظ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں تو اسی کو شراب حاصل ہوتی ہے جو خود بڑھ کر پیمانہ ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اس شعر کے معنی کو ذرا سا اگر پھیلا کر دیکھا جائے اور بزم

مئے کو استعارہ سمجھ لیا جائے تو اس شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں ہمیں کبھی بھی اپنا حق مانگ کر نہیں ملتا۔ تو پھر ایسے جہاں میں لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت ہے ہی نہیں بلکہ اپنا حق چھین کر جو لے لے وہی کامیاب ہوگا۔ اردو شاعری میں مئے اور مئے خانے کو بارہا استعارے اور علامات کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بقول غالب ''بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر'' اس شعر میں بھی وہی بات ہے'' مئے'' کی مناسبت سے ''مینا'' کا استعمال شاعر نے کیا ہے لیکن حقیقت اس کی صرف مئے اور مینا تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا اطلاق زندگی کے مختلف مواقع پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ شعر شاد کے بے حد مقبول شعروں میں سے ایک ہے جو زبان زد عام و خاص ہے۔

تیسرا شعر: شراب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے بعد آدمی سچ بولتا ہے اور شرابی کے سامنے کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہوتا بلکہ سبھی اس کے سامنے برابر ہوتے ہیں۔ دراصل شرابی کے سامنے کوئی چھوٹا بڑا' اعلیٰ ادنیٰ' اچھا' برا نہیں ہوتا بلکہ اس کے سامنے انسان' انسان ہوتا ہے اور وہ سب کو برابر سمجھتا ہے۔ شاعر یہی بات کہہ رہا ہے کہ اصلی شرابی وہی ہے جس کے سامنے اعلیٰ اور ادنیٰ سبھی برابر ہوں اور حقیقت میں اسی کا پینا' پینا ہے۔ وہ شرابی' شرابی ہرگز نہیں ہو سکتا جو اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے میں فرق کرتا ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت میں وہ انسان بڑا ہو سکتا ہے جو سب سے یکساں برتاؤ کرتا ہو۔ لوگوں کو دیکھ کر ان سے سلوک کرنا مناسب نہیں ہے۔ لہذا انسان کو بلا کسی لحاظ کے سب سے ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے۔

چوتھا شعر: انسان کی سب سے بڑی دشمن خود اس کی آرزوئیں' خواہشیں اور تمنائیں ہیں اور آدمی انہیں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اور کبھی بھی اس کی آرزوؤں کا اختتام نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاد کہتے ہیں کہ جب ہماری امیدیں حد سے زیادہ بڑھتی ہیں تو بہ ظاہر ہمیں اچھا لگتا ہے لیکن حقیقت میں یہ سانپ ہیں لیکن کون سے سانپ؟ طلسمی سانپ! یعنی ابھی نظر آئے اور ابھی غائب' آرزوؤں اور امیدوں کے بڑھنے کو جو شخص توڑ دے حقیقت میں اسی کے ہاتھ اس دنیا کا خزانہ لگ سکتا ہے اور وہی چین کی زندگی جی سکتا ہے۔ آرزوؤں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی لہٰذا ان کی انتہا کو توڑ کر ہی اصل زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

پانچواں شعر: اس شعر میں شاعر خود اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اے شاد! اس بڑھاپے میں اپنا دل کدورت یعنی میلے پن یا برائی سے دور رکھ! کیونکہ ہمیں بالآخر جس کو دکھانا ہے۔ یہ آئینہ اسی کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ سب ٹھیک اسی طرح اوپر والے کے سامنے ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ ہمارے سامنے آئینے میں ہمارا عکس ہمیں نظر آتا ہے۔ اس شعر میں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ شاعر کا تخاطب خود اپنے آپ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو یہ درس دینا چاہ رہا ہے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ پیغام سبھی کو دینا چاہ رہا ہے کہ اپنا دل تمام طرح کی گندگی سے صاف رکھیں کیونکہ بالآخر یہ آئینہ ہے اوپر والے کا' جو ہمارے دلوں کے حال اسی آئینے سے دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو برائی سے دور رہنا چاہیے اور نیک کام کی طرف قدم بڑھاتے رہنا چاہیے۔ ایک چیز یہاں خاص طور سے لائق توجہ ہے وہ ہے پیری یعنی بڑھاپا۔ کہ شاد اب تک تو جو کیا سو کیا لیکن اب اس بڑھاپے میں تو کم سے کم اپنا دل صاف رکھ اور کچھ کار خیر کر' کیونکہ آخر کار لوٹ کے تو جانا ہی ہے اور وہ وقت بہت ہی قریب ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. بداعت اسلوب سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

10. شاد کی شاعری میں کس شاعر کے رنگ کا عکس جھلکتا ہے؟

3.7 خلاصہ

شاد عظیم آبادی کا اصل نام علی محمد تھا اور وہ سید اظہار حسین عرف عباس مرزا کے فرزند تھے۔ شاد کی ولادت عظیم آباد (پٹنہ) میں 18 جنوری 1846ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوگئی پھر آگے کی تعلیم لائق اساتذہ سے حاصل کی۔ شاد نے پوری عمر زبان و ادب کی خدمت میں گزاری اور تقریباً ساٹھ تصانیف یادگار چھوڑیں۔ ان کی علمی خدمات کا اعتراف انگریزی حکومت نے بھی کیا اور 1891ء میں انہیں خان بہادر کے خطاب عطا کیا۔ شاد کی اہم تصانیف سروش ہستی' فروغ ہستی اور میخانۂ الہام وغیرہ ہیں۔

شاد نے مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی اور قطعات سبھی کچھ کہے لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے۔ ان کی غزلیں سادگی، گھلاوٹ، ترنم، کیف اور تاثیر کے لحاظ سے منفرد مقام کی حامل ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کا بڑا حصہ اپنے مذہبی تناظر اور دینی پس منظر کی وجہ سے اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا کہ جب تک ان امور پر گہری نظر نہ ہو۔ انہوں نے شعری لب و لہجے کے سلسلے میں دبستان دہلی سے زیادہ اثر قبول کیا۔ لیکن دبستان لکھنؤ کی اہم شعری خصوصیات بھی اکثر و بیشتر ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

شامل اکائی دونوں غزلیں شاد کی غزلیہ شاعری کی انہی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پہلی غزل کے منتخب اشعار ایک ہی مزاجی کیفیت رکھتے ہیں۔ شاد نے سادہ زبان اور عام فہم الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دوسری غزل بھی کم و بیش انہیں خصوصیات کی حامل ہے۔ انسان کی آرزوؤں کا ذکر یہاں بھی ہے۔ بزم مئے میں خود بڑھ کر پیمانہ اٹھا لینے کی بات بھی کہی گئی ہے۔ اس طرح یہ غزل بھی شاد کے شعری مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ اسی طرح شاد کی غزل گوئی اپنے انفرادی لب و لہجے کے باعث اردو کی غزلیہ شاعری میں ایک اہم اور منفرد آواز بن کر سامنے آتی ہے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 شاد عظیم آبادی کی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں اپنی واقفیت سے آگاہ کیجیے۔

2 شاد کی شعری و نثری تخلیقات کے بارے میں اپنی معلومات سے واقف کرائیں۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 شاد کے سوانحی حالات قلم بند کیجیے۔

2 شاد کی عشقیہ شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

3 شاد کی غزلوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ روشنی ڈالیے۔

3.9 فرہنگ

گوناگوں = طرح طرح کا۔رنگ برنگ ایام = یوم کی جمع دن، زمانہ

اجسام = جسم کی جمع، تن، بہت سے جسم ارواح = روح کی جمع، روحیں

طبع آزمائی = ذہانت کا امتحان، طبیعت کی آزمائش طبع = طبیعت، فطرت، مزاج، سرشت

لیاقت = قابلیت، استعداد مراثی = مرثیہ کی جمع

خاطرخواہ = حسب منشا، حسب مرضی تہنیت نامہ = مبارک باد کا خط

طلسم کدہ = جادوگھر تکمیل = پورا کرنا، تمام کرنا

فغاں = شور، غوغا، نالہ، واویلا صلہ = انعام، تحفہ، عطا

نقش = صورت، نگار، شبیہ اعتراف = مان لینا، تسلیم کرنا

کشکول = فقیروں کا پیالہ، بھیک کا ٹھیکرا بطن = پیٹ، شکم، کسی چیز کا اندرونی حصہ

بلیغ = پورا، کامل، فاضل النحو = طور، ڈھنگ، راہ

الصرف = وہ علم جس سے کلموں کی شناخت اور ادل بدل معلوم ہوتی ہے۔

جنباں = ہلتا ہوا، لرزاں منطق = گویائی، گفتگو

وحدت الوجود = صوفیوں کی اصطلاح میں تمام موجودات کو خدائے تعالیٰ کے وجود کا حصہ ماننا

وحدت الشہود = اصطلاحِ تصوف، دنیا کی ہر چیز جو سامنے ہے اللہ کا پرتو ہے

اصناف = صنف کی جمع، قسمیں معنویت = باطن پن

بعض = چند، متعدد، مختلف استفادہ = فائدہ اٹھانا، نفع حاصل کرنا،

تفہیم = سمجھانا سبو = گھڑا، مٹکا

والہانہ = عاشقانہ انداز سے، ٹوٹ کر معجزہ = قوتِ انسانی سے باہر بات کرنا

تجاہل عارفانہ = جان بوجھ کر انجان بننا چشم = آنکھ

خمریاتی = خمر سے متعلق، ایسے اشعار یا شاعری جس میں شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر ہو

3.10 معاون کتابیں

1. ذیشان فاطمی — شاد عظیم آبادی، ساہتیہ اکادمی، 1996ء
2 پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی — شاد کی کہانی، شاد کی زبانی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، 1961ء
3. سیدہ جعفر — تاریخ ادب اردو (عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک، جلد دوم)، حیدرآباد، 2002ء
4. فاطمہ بیگم — لمعاتِ شاد، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1964ء

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1 شاد کا اصلی نام علی محمد تھا۔ وہ پٹنہ میں 8 جنوری 1846ء کو پیدا ہوئے تھے۔

2 ریاض عمر، میخانۂ الہام اور سروش ہستی

3. مجسٹریٹ کے عہدے پر اور میونسپل کمشنر کے عہدے پر۔

4. شہنشاہ دو عالم سے مراد حضور پاک ﷺ کی ذات مبارک ہے۔

5. جہاں پہنچے اسی کا نور پایا — جدھر دیکھا وہی خورشید رو تھا

6. شاد کی زبان پر دبستانِ دہلی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

7. ''رونق بزم'' محبوب کا استعارہ ہے۔

8. اس کا سہل ممتنع ہونا۔ یعنی بہت آسان اور نثر کے انداز میں شعر کہا گیا ہے۔

9. بداعت اسلوب وہاں قائم ہوتا ہے جب شاعر پرانے مضمون کو نئے لفظی پیکر میں پیش کر ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کرتا ہے۔

10. شاد کی شاعری سے میر تقی میر کی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔

بلاک نمبر 2

اکائی 4. خواجہ حیدر علی آتشؔ

اکائی 5. مومن خاں مومنؔ

اکائی 6. اسد اللہ خاں غالبؔ

یہ بلاک بھی اُردو کے تین اہم غزل گو شعرا آتشؔ ، مومنؔ اور غالبؔ سے متعلق ہے۔ آتشؔ، مصحفی کے شاگرد، دیا شنکر نسیم کے استاد اور ناسخ کے ہم عصر تھے۔ وہ اُس زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے جب وہاں اصلاح زبان کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ یہ دور لکھنؤ میں شعر و ادب کے لیے سنہرا دور تھا۔ گھر گھر شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں اور شعرا کی حوصلہ افزائی عام بات تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں وہاں کی شاعری زلف و کاکل میں اُلجھ کر رہ گئی تھی لیکن آتش نے ایک نئی راہ نکالی اور اُنہوں نے بڑی عمدہ غزلیں یادگار چھوڑی ہیں۔

مومن اور غالب نے ایک ہی زمانے میں اور ایک ہی شہر یعنی دہلی میں شاعری کی۔ مومن نے اُردو شاعری کو ایک نیا مزاج اور نیا آہنگ عطا کیا۔ اُنہوں نے اُردو غزل میں عشق کے موضوعات کو وسعت بخشی اور زبان و بیان میں ندرت پیدا کی۔ غالبؔ انتہائی ذہین اور ذکی الحس شاعر تھا۔ ایسا شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ان کی بدولت اُردو شاعری کو اعلیٰ معیار اور وقار حاصل ہوا۔ آیئے ان شعرا کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں!

اکائی: 4 خواجہ حیدر علی آتش

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 خواجہ حیدر علی آتش: حیات

4.4 آتش کی غزل گوئی

4.5 آتش کی غزل (1)

4.5.1 مجموعی تاثر

4.5.2 غزل کی تشریح

4.6 آتش کی غزل (2)

4.6.1 مجموعی تاثر

4.6.2 غزل کی تشریح

4.7 خلاصہ

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 معاون کتابیں

4.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ خواجہ حیدر علی آتش کے حالات زندگی، شخصیت، فن، شاعرانہ اہمیت اور ان کے کلام کی شعری خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔ زیر نظر اکائی میں آتش کی دو غزلیں شامل ہیں جن کی تشریح سے آپ واقف

ہوجائیں گے کہ وہ کون سے شعری محاسن ہیں جن سے آتش کی شعری انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ان غزلوں کے مطالعے سے آپ کو آتش کے کلام کے سمجھنے میں خاطر خواہ آسانی ہوگی۔

4.2 تمہید

آتش انیسویں صدی کے بہت اہم شاعر ہیں یہ زمانہ لکھنؤ کی شاعری کے لیے بے حد اہم زمانہ تھا اس زمانے میں اردو زبان اور شاعری میں بہت تبدیلیاں آئیں۔زبان کی تبدیلیوں کی وجہ سے لکھنو کی شاعری کو ایک الگ دبستان قرار دیا جانے لگا۔آتش کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں اس زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری میں شگفتگی اور مسرت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔بعض شاعروں کے کلام کو پڑھ کر اداسی اور غم کا احساس ہوتا ہے۔لیکن آتش کی شاعری ہمیں زندگی کا حوصلہ اور خوشی کا احساس دیتی ہے اس لیے ان کے کلام کو بار بار پڑھنے کا جی چاہتا ہے۔ آتش ان شاعروں میں ہیں جنھیں ان کے عہد میں بھی بڑا شاعر مانا گیا ہے اور آج دوسو سال بعد بھی انھیں بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

4.3 خواجہ حیدر علی آتش: حیات

آتش کا اصل نام خواجہ حیدر علی اور آتش تخلص تھا۔والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔آتش کے والد دلی سے فیض آباد آئے اور محلّہ مغل پورہ میں قیام کیا۔وہیں 1778ء میں آتش کی پیدائش ہوئی۔کم عمری میں والد کی وفات کے سبب آتش کا تعلیمی سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔البتہ عربی و فارسی ضرور پڑھتے رہے اور اپنے ذاتی مطالعے و محنت سے خود کو آگے بڑھایا۔

آتش کا ذکر کرتے ہوئے مختلف تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آتش خوبصورت' گورے' لمبے اور چھریرے بدن کے تھے۔والد کے انتقال کی وجہ سے بچپن ہی سے آزاد زندگی گزاری۔کسی بڑے کے نہ ہونے کی وجہ سے آتش آزاد خیال ہوگئے۔اس زمانے میں فیض آباد میں سپہ گری اور بانکپن کا زور تھا۔آتش پر بھی اس کا اثر ہوا۔مغل زادوں کے ساتھ رہ کر انہوں نے تلوار چلانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔مزاج میں جوش تھا۔لہذا بات بات پر تلوار نکال

لیتے۔اسی لیے لوگ انہیں تلوریے کہنے لگے۔

آتش نے شاعری کی ابتدا میں فارسی اور اردو میں شعر کہے۔اگر چہ ان کا فارسی کلام نہیں مل سکا ہے، لیکن ان کے استاد مصحفی (اس عہد کے مشہور شاعر) نے آتش کی فارسی گوئی کا ذکر کیا ہے۔فیض آباد میں آتش کی شاعرانہ صلاحیتوں سے نواب محمد تقی خاں خاصے متاثر تھے۔انہیں شاعری اور سپہ گری دونوں سے دلچسپی تھی۔آتش نے ان کی ملازمت اختیار کی۔نواب محمد تقی خاں کے لکھنؤ چلے آنے پر آتش بھی فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔لکھنؤ اس وقت شعر و ادب کا مرکز تھا۔آتش کا اپنا شوق اور ساتھ میں مصحفی جیسے استاد کی اصلاح نے ان کی شاعری میں چار چاند لگا دیے۔مصحفی آتش سے بہت محبت کرتے تھے۔انہوں نے آتش کو وجیہہ اور مہذب الاخلاق قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اگر عمر نے وفا کی تو یہ شخص یکتائے زمانہ ہوگا۔''

نواب محمد تقی کے انتقال کے بعد آتش نے کسی اور کی ملازمت کرنا پسند نہیں کیا۔انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق آزاد زندگی گزاری۔آتش مخلص اور سادہ لوح انسان تھے۔کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔دوستوں اور شاگردوں سے بھی اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔مہمان نوازی کا شوق تھا اور اکثر اپنی دولت مہمان نوازی میں خرچ کرتے۔آتش کو خدا پر بھروسہ تھا۔ان کا خیال تھا کہ خدا نے جو کچھ دیا ہے اس پر انسان کو صبر کرنا چاہیے۔اپنے ایک شاگرد کو بنارس جانے سے روکنے کے لیے انہوں نے بڑا دلچسپ و خوبصورت انداز اپنایا۔

> ''آتش کے ایک شاگرد بیروزگاری سے تنگ آ کر سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے۔اور خواجہ صاحب کہا کرتے تھے۔''میاں کہاں جاؤ گے؟'' دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو اور جو خدا دیتا ہے اس پر صبر کرو۔ایک دن آئے اور کہا'' حضرت رخصت کو آیا ہوں۔فرمایا''خیر باشد'' کہاں؟ انہوں نے کہا کل بنارس کو روانہ ہوں گا۔کچھ فرمائش ہو تو فرما دیجیے۔آتش ہنس کر بولے''اتنا کام کرنا وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہہ دینا'' وہ حیران ہو کر بولے حضرت یہاں اور وہاں کا خدا کوئی جدا

ہے؟ فرمایا'' شاید یہاں کا خدا بخیل ہے اور وہاں کا خدا سخی ہو۔'' انہوں نے کہا'' معاذ اللہ آپ کے فرمانے کی یہ بات ہے۔''

خواجہ صاحب نے کہا بھلا سنو تو سہی، جب خدا وہاں یہاں کا ایک ہے تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو؟ جس طرح اس سے وہاں جا کر مانگو گے اسی طرح یہاں بھی مانگو جو وہاں دے گا تو یہاں بھی دے گا۔ اس بات نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا اور خاطر جمعی سے بیٹھ گئے۔

آخری عمر میں آتش کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ آتش کا انتقال 71 برس کی عمر میں 13 جنوری 1847ء کو ہوا۔ آتش کا کلام ان کی زندگی میں 1840ء میں مطبع علوی لکھنوی سے شائع ہوا۔ بعد میں دیوان دوم کے اضافے کے ساتھ اسی مطبع سے چھپا۔

آتش کے شاگردوں نے ان کا نام خوب روشن کیا۔ ان کے اہم شاگردوں میں نواب مرزا شوق، پنڈت دیا شنکر نسیم، واجد علی شاہ اختر، دوست علی خلیل، خواجہ مجو شریف، نواب سید محمد خاں، اور میر وزیر علی صبا وغیرہ شامل ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

1. آتش کا پورا نام لکھیے۔
2. آتش کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟
3. آتش کے پانچ شاگردوں کے نام لکھیے۔

4.4 آتش کی غزل گوئی

دہلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ، شعر و ادب کا مرکز بنا۔ روزگار کی تلاش میں شاعر دہلی سے لکھنؤ کا رخ کرنے لگے جہاں اس زمانے میں دولت کے دریا بہہ رہے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو، سودا، سوز، جرأت، انشا اور مصحفی لکھنؤ پہنچے اور محفلِ سخن آراستہ ہوگئی۔

لکھنؤ میں اس زمانے میں زبان کی اصلاح پر خاص طور سے توجہ کی گئی یعنی ایسے الفاظ جو سننے میں بُرے معلوم ہوتے تھے انہیں ترک کیا گیا اور ان کی جگہ نئے الفاظ رائج کیے گئے۔ مثلاً تک کی جگہ ذرا' تجھ سوا کی بجائے تیرے سوا وغیرہ۔ انشا و مصحفی کے علاوہ شیخ امام بخش ناسخ نے بھی اصلاح زبان کی طرف خصوصی توجہ کی۔ خواجہ حیدر علی آتش اسی زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ ناسخ اور آتش کا دور لکھنؤ میں شعر و ادب کا سنہرا دور ہے۔ گھر گھر شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں۔ شعرا کی حوصلہ افزائی عام بات تھی۔ جس کی وجہ سے شاعری زلف و کاکل میں الجھ کر رہ گئی۔ آتش نے یہاں بھی الگ راہ نکالی۔ اسی وجہ سے انہیں ناسخ کے مقابلے میں حقیقی شاعر قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا خیال ہے کہ:

> ''لکھنوی شاعری کے عام رنگ کو انہوں نے آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا۔ جذبات نگاری جس کی مثالیں عام طور پر لکھنوی شعرا کے کلام میں مفقود ہیں آتش کا خاص رنگ ہے.....اس عہد کے پر تکلف رنگ کے علی الرغم وہ سادگی اور سلاست کی طرف مائل ہیں۔''

آتش کے کلام سے ان کی سادگی اور سلاست کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری کے متعلق کہا ہے کہ سب سے پہلے شاعر کے دماغ میں خیال آتا ہے اس کے بعد وہ اسے سنوارنے کا کام کرتا ہے۔ آتش شاعری کو اپنے مطالعے اور مشاہدے سے زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے کئی جگہ شاعری کو مصوری کہا ہے۔

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

آتش قلندرانہ مزاج لے کر آئے تھے۔ توکل و قناعت ان کی شخصیت کا حصہ ہے انہوں نے لکھنؤ کا سنہرا دور دیکھا لیکن کبھی شان و شوکت سے زندگی گزارنے کی خواہش نہیں کی مثلاً وہ کہتے ہیں۔

توڑتا پاؤں جو تخت کی خواہش کرتے
کاٹتا سر کو اگر مائل افسر ہوتا

دست حاجت کو کیا تیغِ قناعت نے قلم

گنج قاروں سے خدا نے دی بڑی دولت مجھے

آتش زندگی کی مشکلات سے گھبراتے نہیں وہ دشواریوں کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں اور زندگی کی سخت راہوں پر بہ آسانی آگے بڑھنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہ اشعار ان کی بلند حوصلگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

پھر گئے ہیں معرکوں میں مجھ سے تلواروں کے منھ

سخت جانی نے میری توڑے ہیں خنجر سینکڑوں

واماندگی سے میری نالاں نہ ہو اے جرس

منزل میں سب سے دیکھو تو پیشتر مجھے

یہ بہادرانہ انداز، یہ زور، یہ کس بل اور حوصلہ سب آتش کو زیبا ہے۔ مغل زادوں کے ساتھ رہنے کے سبب ان کے مزاج میں شجاعت و مردانگی پیدا ہوئی تھی بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ''آتش کی آواز ایک البیلے سپاہی کی آواز ہے جس کے اندر شاعر، رند اور صوفی بھی ہے۔ آتش کے اشعار ان کی درویشانہ زندگی کے عکاس ہیں۔

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار

بوریے پر بیٹھے ہیں قالین کو ٹھوکر مار کے

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال

ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا۔

آتش کو دنیاوی عیش و عشرت کی کوئی پرواہ نہیں ہے وہ تو امیری چھوڑ کر اپنی غریبی میں خوش ہیں قالین سے زیادہ آرام و سکون انہیں بوریے پر بیٹھ کر ملتا ہے۔ ان کے پاس ملک و مال نہیں ہے۔ اسی لیے انہیں زمانے کی پرواہ نہیں چاہے لوگ ان کی کتنی مخالفت کریں جب کچھ کھونے کا خوف ہی نہیں ہے تو وہ زمانے کی پرواہ کیوں کریں۔

دنیا کی حقیقت سے آتش بخوبی واقف ہیں دنیا کی بے ثباتی انہیں ملک و دولت، جاہ و حشمت کی خواہش سے دور رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کی کسی شئے کو قرار نہیں۔ ہر چیز فانی ہے ختم ہونے والی ہے۔ دولت آج کسی کے پاس ہے کل کسی کے پاس۔ دنیا میں نہ جانے کتنے شہنشاہ آئے اور چلے گئے لیکن آسمان اور زمین کے رنگوں کو کوئی نہیں سمجھ پایا۔ نہ سکندر کی قبر باقی رہی اور نہ ہی دارا کی گور۔ نہ جانے کتنی عظیم ہستیاں مٹ گئیں۔ یہ دنیا سرائے فانی ہے اس کی تمنا بیکار ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

دنیا کو آتش ایک کے اوپر نہیں قرار
یہ آج کل وہ صاحبِ طبل و علم ہوا
زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے
غافلو منزل دنیا ہے سرائے فانی
اس خطر گاہ میں تم چھاؤنی چھاتے ہو عبث

آتش کی خوبی یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا فانی ہے وہ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتے۔ وہ امید کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں۔ زندگی کی بے چارگی و گھٹن پر کڑھتے ہیں ان کا غم انسان کے لیے عظمت و قوت کا ضامن ہے۔ وہ تو لوہے کو موم کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

خار کا کھٹکا نہیں رکھتے ہم آتش قدم
موم ہوجائے اگر آجائے آہن زیرپا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتریے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

ان اشعار میں آتش جس طرح زندگی کی مشکلات میں جدوجہد اور حوصلے سے کام لینے کی بات کرتے ہیں وہ ان کی مضبوط قوت ارادی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کا یہ پیغام (کہ اگر انسان کسی کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لے تو پھر کوئی مشکل اس کی راہ کو نہیں روک سکتی نہ جانے کتنے مدد کرنے والے ہاتھ اس کی طرف بڑھیں گے۔ شرط یہی ہے کہ تھک کر رکے نہیں بلکہ جدوجہد کو اپنا شعار بنالے) بغیر کسی کڑوی نصیحت کے نہایت سادہ انداز میں ہم تک پہنچ جاتا ہے۔

آتش باہمت ہونے کے ساتھ ساتھ خوددار بھی ہیں۔ زمانے کے آگے جھکنا انہیں منظور نہیں ان کی خودداری اور قلندرانہ صفت کی وجہ سے ان کا لب ولہجہ دوسرے شعرا سے مختلف ہے۔ آتش کے اشعار ہمارے دل ودماغ پر جادو کا اثر کرتے ہیں وہ اپنی اس خوبی پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تیرے شیریں کلام کو سن کر
پھر نہ آتش کسی کی بھائی بات
وہ آتش کہ یاں زبان رکھتا ہے کیف کے ساتھ
سامعیں ہوتے ہیں سن سن کے ترے اشعار مست

آتش کی غزلوں کے مطلع ان کے اس دعویٰ کا ثبوت ہیں کہ ان کے اشعار اپنے اندر سننے والے کو محو کرنے کی خوبی رکھتے ہیں۔ لوگ ان کے کلام کو سن کر پھر کسی اور کے کلام کو سننا پسند نہیں کرتے۔ ان کی غزل کے یہ دو خوبصورت مطلع دیکھیے۔

تصور سے کسی کے کی ہے میں نے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے ۔

آتش عام آدمی کے درد وغم اور ان کی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں کو اپنی غزلوں کا موضوع بناتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل، ہماری آرزوئیں، تمنائیں، ناکامی وحسرت، غیرت، حوصلہ، شکوہ، دوستی، توکل، شوخی، بے فکری جیسی زندگی کی حقیقتوں کو آتش سادہ وسلیس انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ چند اشعار اسی سلسلے کے ملاحظہ کیجیے۔

فرشِ گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر ہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست
دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلا جاتا رہا
ہزاروں حسرتیں جائیں گی میرے ساتھ دنیا سے
شرر اور برق سے بھی عرصہ ہستی کو کم پایا

زندگی میں وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ پہلے شعر میں شاعر اس عہد کو یاد کر رہا ہے جب وہ محبوب کے زانو پر سر رکھتا تھا۔ آج عالم یہ ہے کہ اینٹ تک سر کے نیچے نہیں۔ پہلے پھولوں کا بستر میسر تھا۔ آج خاک پر سونا پڑ رہا ہے۔

دوسرے شعر میں دوستوں کی بے وفائی کی شکایت کی ہے۔ دوستوں نے اس قدر غم دیے ہیں کہ دشمنوں کی عداوت کی شکایت نہیں رہی۔ تیسرے شعر میں شاعر زندگی کے مختصر ہونے کی بات کہہ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ زندگی کی مدت اتنی کم ہے کہ ہزاروں آرزوئیں حسرت ہی رہ گئیں اس کی مثال چنگاری اور برق سے دی ہے۔ شرر اور برق کی طرح زندگی بھی تیزی سے ختم ہوگئی۔

آتش واعظ کو بھی نصیحت کرتے ہیں۔

نہ کہہ رندوں کو حرفِ سخت واعظ　　درشت اہل جہنم کی زباں ہے

غزل کا سب سے اہم موضوع عشق رہا ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک شاعروں نے عشقیہ موضوعات کو غزل میں پیش کیا ہے۔ آتش نے یہاں بھی اپنی الگ راہ نکالی ہے۔ ان کی غزلوں کا عاشق ہمیں مایوس و نامراد نظر نہیں آتا وہ ایک پروقار شخصیت کا مالک ہے۔ محبوب بھی اپنے عاشق کا قدردان ہے اور اس کی دلجوئی کرتا ہے۔ آتش کا محبوب بازاری نہ ہو کر عفت و پاکیزگی کے زیور سے آراستہ ہے۔ اگرچہ اس عہد کے دوسرے شعرا (انشا اور رنگین) کے موضوعات خالص عاشقانہ ہیں آتش کا محبوب دوسروں سے مختلف ہے وہ اتنا حیادار اور پارسا ہے کہ مرغِ سلیماں اس کے بام تک نہیں جا سکتا۔ کہتے ہیں

عاشق اس غیرت بلقیس کا ہوں اے آتش
بام تک جس کے کبھی مرغ سلیماں نہ گیا

تکیہ تک پہلو میں اس گل نے نہ رکھا
غیر کو ساتھ کبھی یار نے سونے نہ دیا

ایسے باعصمت و پاکیزہ محبوب پر کون نہ قربان ہو جائے۔ یہی سبب ہے عاشق محبوب کا ہر ناز برداشت کو تیار ہے محبت میں نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی عاشق اس خلش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ہجر کی شب ہو چکی روزِ قیامت سے دراز
دوش سے نیچے نہیں اترے ابھی گیسوے دوست

اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

آتش نے اپنے کلام میں فارسی تراکیب کے علاوہ اردو کے ٹیٹھ الفاظ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ مثلاً ان اشعار کو ملاحظہ کیجیے۔

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا بھاری ہے بوجھ کون یہ بیگار لے چلے

کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا　　روز و شب چرخ ہنڈولے کی طرح ہلتا ہے

بولی یہ روح پھینک کے پشتارہ جسم کا　　کس طرح سے یہ زمانہ تہہ و بالا ہووے

یہاں ٹوٹا پیالہ، بیگار، ہنڈولہ خاص اردو کے الفاظ ہیں اور عام مشاہدات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آتش نے فارسی تراکیب کو بھی اردو کے مزاج سے اس قدر شیر وشکر کر دیا ہے کہ وہ اجنبی نہیں معلوم ہوتیں۔ مثلاً تارتار پیرہن، عالی منزلت، مرغِ روح وغیرہ۔ مولوی محمد حسین آزاد اپنی تصنیف آب حیات میں لکھتے ہیں۔

''جو کلام ان کا ہے.....شرفائے لکھنو کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے شعر کہہ دیے ہیں ان کے کلام نے پسند خاص وعام کی سند حاصل کی۔''

اس اقتباس میں آتش کی شاعری پر خاصی اہم رائے دی گئی ہے۔ آزاد کے خیال میں آتش کی شاعری کا انداز بول چال کا ہے ایسا لگتا ہے جیسے لوگ باتیں کر رہے ہوں۔

بیسویں صدی کے غزل گو شعرا میں یگانہ اور فراق، آتش کے دلدادہ ہیں۔ یگانہ کے لب و لہجے کی سرکشی، بانکپن، کس بل، توانائی اور فراق کے لہجے کی سرشاری پر آتش کا اثر واضح طور سے نظر آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے۔

4. آتش کا محبوب دوسروں سے کس طرح مختلف ہے؟

5. بیسویں صدی کے کون سے شعرا آتش سے متاثر ہیں؟

4.5 آتش کی غزل (1)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر　　دلِ صاف ہو تیرا، تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال　　ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

آتی ہے کس طرح سے ؟میری قبض روح کو　　دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے　　آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

4.5.1 مجموعی تاثر

بے حد خوبصورت غزل ہے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات غزل کا موضوع ہیں۔ ہر شعر میں سادہ وسلیس انداز میں الگ بات کہی گئی ہے۔غزل کا مطلع توپر کشش ہے ہی مقطع بھی شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے

4.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: شعر پڑھنے کے ساتھ ہی آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آتش کیسے خوبصورت اور سادہ انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ یہ غزل کا پہلا شعر ہے اس لیے مطلع کہلائے گا۔ آتش نے بڑے پر اثر انداز میں ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی میں ہم اپنے بارے میں جو کچھ سوچتے ہیں وہ حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ دوسروں کی ہمارے متعلق رائے کیا ہے؟ ہماری عدم موجودگی میں لوگ کیا سوچتے ہیں۔اس پر ضرور غور کرنا چاہیے۔اسی لیے آتش کہتے ہیں تم اس بات کو ضرور سنو کہ تمہاری کہانی کیا ہے لوگ تمہارے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں۔اگر اپنے کردار کا اندازہ کرنا ہے تو لوگوں کی گفتگو سنو تب تم جان پاؤ گے کہ تمہارے اندر کیا خوبیاں ہیں اور کون سی خامیاں ہیں۔

دوسرا شعر: اس بات سے تو آپ واقف ہی ہیں کہ اگر ہمارا دل صاف ہے تو زندگی سکون واطمینان سے گزرتی ہے ہم سب سے محبت کرتے ہیں اور سب ہم سے لطف ومہربانی سے پیش آتے ہیں۔ آتش نے اس شعر میں دل کی نیکی سے ہونے والے فائدے کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہارا دل صاف ہے تو محبوب کا جلوہ اس میں ہر طرف نظر آئے گا۔لیکن اگر دل کدورت سے بھرا ہوگا تو تم اپنے دوست کو نہیں دیکھ سکو گے۔ دل اگر صاف ہے تو اس کے آگے آئینہ خانہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔جس طرح آئینہ خانہ میں لگے ہر آئینہ میں تصویر دکھائی دیتی ہے۔اسی طرح دل کے نیک وسادہ ہونے پر تمھیں اس میں ہر طرف محبوب کا جلوہ نظر آئے گا۔شاد نے بھی اسی طرح کا خوبصورت شعر کہا ہے:

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شاد پیری میں کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

تیسرا شعر: طبل وعلم پاس ہے اپنے نہ ملک و مال۔ ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا شاعر کہتا ہے کہ زمانے کے فکر ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے پاس کھونے کے لیے کچھ ہو ہم تو بے فکر، قلندر، درویش انسان ہیں۔ ہمارا کام تو زندگی کو اسی انداز سے جینا ہے کہ آزاد اور خوش رہیں نہ ہمارے پاس طبل وعلم ہے اور نہ ملک و مال یعنی نہ بادشاہت اور نہ دولت وحکومت۔ اگر لوگ ہمارے خلاف ہوتے ہیں ہوا کریں ہمیں کوئی خوف نہیں۔ قابل داد شعر ہے شاعر نے بہت اہم بات کہی ہے کہ زندگی بھر آوارہ دوست رہنے کی وجہ سے ہم نے دولت جمع نہیں کی کوئی عہدہ ہمارے پاس نہیں اس لیے ہمیں کسی چیز کے کھونے کا ڈر نہیں۔ اس شعر میں آتش کی شخصیت کی خودداری، بانکپن اور آزادانہ زندگی کی جھلک واضح ہے۔

چوتھا شعر: اس شعر کو پڑھیے آپ شاعر کے ہمت وحوصلے کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لوگ تو معمولی پیریشانیوں سے ہار جاتے ہیں۔ مگر آتش موت سے مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ میں تو موت کا انتظار کر رہا ہوں دیکھوں تو موت میری روح کس طرح قبض کرتی ہے۔ وہ کون سا بہانہ ڈھونڈ رہی ہے۔ آتش کی شخصیت کی مضبوطی اس شعر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ انہیں موت کا خوف نہیں۔ آتش مغل زادوں کے ساتھ رہے، تلوار زنی میں ماہر تھے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ان کی شخصیت میں آزادی، بے خوفی اور بانکپن پیدا ہو گیا۔ یہی سبب ہے کہ وہ موت سے بھی نہیں ڈرتے بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بے چین ہیں۔

پانچواں شعر: غزل کا یہ آخری شعر ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔ مقطع میں عام طور پر شاعر اپنے تخلص کا استعمال کرتا ہے۔ اس شعر میں آتش نے بڑی اہم بات کہی ہے۔ ان کے خیال میں انسان کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ خود ہونا چاہیے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اے آتش تم نے بڑی خوبصورت وعاشقانہ غزل کہی ہے۔ چاہے مدعی جلن/حسد کے سبب اس کی تعریف نہ کرے۔ تمہاری غزل تعریف کی حقدار ہے۔ تم لوگوں کی پرواہ مت کرو کیونکہ غزل اچھی ہے تو وہ خود ہی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

6. غزل کے پہلے شعر میں زندگی کی کس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟
7. شاعر کو زمانے کی پرواہ کیوں نہیں ہے؟
8. غزل کے چوتھے شعر میں شاعر کس کا انتظار کر رہا ہے؟

4.6 آتش کی غزل (2)

یہ آرزو تھی، تجھے گل کے روبرو کرتے — ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبان غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ — کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تیری زنجیر زلف کا عالم — اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

وہ جان جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی — دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعیِ آتش — برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

4.6.1 مجموعی تاثر

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آتش کی مشہور غزل آپ کے نصاب میں ہے۔ اس غزل میں لفظ آرزو کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ محبوب اور گل کے حسن کے موازنے کی آرزو، اپنی زبان سے محبوب سے حال دل کہنے کی آرزو، سورج اور چاند کے چکر لگانے کو اپنی آوارگی کی طرح قرار دینا، زندگی کی مصیبتوں سے تنگ موت کی خواہش، محبوب کی لمبی زلفوں میں اسیر ہونے کی آرزو، قسمت کی خرابی، اگر بارش کی خواہش کرتے تو آگ برستی۔ غرض اس غزل میں زندگی کی عام صداقتوں اور انسانی نفسیات کا بیان بڑے پراثر انداز میں ہوا ہے زندگی کے مختلف رنگ اس غزل میں موجود ہیں۔

4.6.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے۔ آتش کی غزل کے مطلع نہایت پراثر

ہوتے ہیں اس شعر میں بھی وہی کیفیت ہے۔ شاعر اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ یہ آرزو کسی عام انسان کی ہوسکتی ہے۔ محبوب کے ساتھ رہنے کی آرزو' گل سے اس کا موازنہ اور پھر دو عاشقوں یعنی گل کے عاشق بلبل بیتاب اور خود عاشق کے درمیان گفتگو جس میں وہ اپنے محبوب کو فوقیت دینا چاہتا ہے حالانکہ اس شعر میں کوئی اہم بات نہیں کہی گئی ایک خوبصورت جذبہ ہے کہ کاش ایسا ہو۔ مگر آتش کا انداز ہمارا دل موہ لیتا ہے۔ عاشق کی آرزو ہے کہ وہ اور بلبل ایک ساتھ اپنے اپنے محبوب کے حسن کا موازنہ کریں اور اس موازنے میں عاشق کا محبوب اول ہو۔

دوسرا شعر: آپ نے ضرور غور کیا ہوگا کہ ہم اپنے دل کی بات کو ہمیشہ اپنی زبان سے کہنے میں لطف محسوس کرتے ہیں شاعر کا بھی یہی خیال ہے کہ دل کی بات محبوب سے اپنی زبان سے کہنے میں جو لطف و مزہ ہے وہ کسی دوسرے سے کہلوانے میں نہیں آئے گا۔ پہلے شاعر کا خیال تھا کہ وہ کسی پیمبر کے ذریعہ اپنا حال محبوب سے کہے گا' لیکن کوئی قاصد نہیں ملا اس لیے شاعر خوش ہے اب وہ محبوب سے براہ راست حال دل کہے گا۔ میر درد کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے　　اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

یعنی اپنے جذبات و احساسات کا بیان جب تک محبوب کے سامنے خود کی زبان سے نہیں کیا جائے لطف نہیں آتا۔ درد بھی یہی کہتے ہیں کہ محبوب کا پیغام سیدھا دل میں آتا ہے۔

تیسرا شعر: غزل میں بات اشارے میں کی جاتی ہے۔ یہاں بھی شاعر اشارے میں اپنی آرزو کا اظہار کرتا ہے وہ کہتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاند سورج کے فضا میں آوارہ گھومنے کی ضرور کوئی وجہ ہے کوئی مقصد ہے شاید وہ بھی میری طرح اپنے محبوب کو تلاش کر رہے ہیں۔ چاند سورج کے گھومنے کو اپنی آوارگی سے تشبیہ دے کر شاعر نے بہت اختصار کے ساتھ اپنے دل کی آرزو کا بیان کر دیا ہے حالی کا شعر ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں؟

یہاں فرق صرف اتنا ہے کہ حالی خوب سے خوب محبوب کی تلاش کر رہے ہیں اور آتش اپنے محبوب کی جستجو۔

چوتھا شعر: محبوب کی زلفوں کی تعریف کی گئی ہے۔ اے دوست اگر تیری زلفوں کی خوبصورتی آزاد لوگ دیکھ

لیتے تو وہ بھی قید ہونے کی خواہش کرتے ۔یعنی محبوب کی زلفیں زنجیر کی سی لمبی ہیں ۔ان کی خوبصورتی ان کا پیچ وخم آزادی پسند لوگوں کو بھی عشق میں مبتلا کر دیتا ہے۔

پانچواں شعر: محبوب کا انتظار ہر عاشق کو رہا ہے۔اردو شاعری کا یہ روایتی موضوع ہے کہ عاشق اپنے معشوق سے ملنے کے لیے بیتاب ہے مگر وہ نہیں آتا اسی لیے موت کی دعا کرتا ہے اپنے غم اور تڑپ کا اظہار کر رہا ہے کہ محبوب کا آنا اگر ممکن نہیں تو مجھے موت آجائے میں کب تک اس کی یاد میں اپنے دل وجگر کو خون کرتا رہوں۔داغ نے کہا ہے:

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا　　تمام رات قیامت کا انتظار کیا

غالب کا یہ شعر بھی اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔

ترے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

چھٹا شعر: یہاں پر شاعر مایوس نظر آتا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ ہماری تقدیر بھی عجیب ہے۔زندگی میں جس چیز کی خواہش کرتے ہیں وہ نہیں ملتی۔اس کے برعکس ہوتا ہے۔مثلاً اگر ہم بارش کی آرزو کریں گے تو آگ برسے گی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. آتش کی غزل کے دو مطلع لکھیے۔
10. غزل کے پہلے شعر میں کس آرزو کا بیان کیا گیا ہے؟
11. دوسرے شعر میں شاعر خوش کیوں ہے؟
12. مقطع کی تشریح آسان زبان میں کیجیے۔

4.7 خلاصہ

اس اکائی میں خواجہ حیدر علی آتش کی حیات اور غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔خواجہ حیدر علی آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔بعد میں لکھنؤ چلے آئے اور مصحفی کے شاگرد ہوئے۔لکھنؤ کی علمی وادبی فضا میں آتش کی شاعری پروان چڑھی۔اس اکائی میں کلام آتش کی چند اہم خصوصیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

آتش مصحفی کے شاگرد، دیا شنکر نسیم کے استاد اور ناسخ کے ہمعصر تھے لیکن انہوں نے اپنا منفرد راستہ نکالا۔ اپنی بعض خصوصیات کے سبب ان کی غزلیں دبستانِ لکھنو سے الگ نظر آتی ہیں۔ آتش کی شخصیت کا بانکپن، خودداری، توکل وقناعت زندگی میں جدوجہد کرنے کی تلقین، کیا نہیں ہے جو ان کی غزلوں میں موجود نہیں۔ محبوب کی حیا، عفت و پاکیزگی، عاشق کی قربانی ووفا، انسانی نفسیات، الجھنیں، پریشانیاں۔ غرض کہ زندگی کے ہر پہلو کو آتش نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ نصاب میں شامل دونوں غزلوں میں سادہ وسلیس انداز میں آتش نے دل کو چھو لینے والی باتیں کہی ہیں۔

آتش کی دو مشہور غزلوں کی تشریح اس اکائی میں کی گئی ہے اور ان کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اپنے مطالعے کی جانچ اور امتحانی سوالات بھی شامل ہیں۔ مختصر جوابات ساتھ میں موجود ہیں۔ نیز کچھ مشکل الفاظ کے معانی فرہنگ میں شامل ہیں۔ اس مقالے کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ ان کے نام آخر میں دیے گئے ہیں تاکہ طلبہ آتش کے فن سے مزید واقف ہوسکیں اور انہیں آتش کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1 ''آتش کا شمار لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں کیا جاتا ہے۔'' وضاحت کیجیے۔

2 آتش کے شاگرد بنارس کیوں نہیں گئے؟ مختصر لکھیے۔

3 آتش کے زمانے میں زبان کی اصلاح کس طرح کی گئی؟

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1 خواجہ حیدر علی آتش کی حیات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2 آتش کی شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کیجیے۔

3 شامل اکائی آتش کی کسی ایک غزل کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

4.9 فرہنگ

جلوہ گر ہونا	ظاہر ہونا	طبل	نقارہ
علم	جھنڈا	مدعی	دعویٰ کرنے والا
آرزو	خواہش	بیتاب	بے چین
پیامبر	پیغام لے جانے والا	غیر	دوسرا
برگشتہ طالعی	بُری قسمت	تیغ زنی	تلوار چلانا
یکتائے زمانہ	بے مثال	توکل	خدا پر بھروسہ
قناعت	تھوڑے پر رضامندی	معاذ اللہ	اللہ کی پناہ
گنج	خزانہ	جرس	گھنٹہ
رند	شرابی	شجر	درخت
واعظ	نصیحت کرنے والا	عبث	بیکار
مطیع	فرمانبردار	خاطر جمعی	دلی سکوں
موقوف	ٹھہرایا ہوا/ختم کیا گیا	سرگرداں	پریشان

4.10 معاون کتابیں

1. محمد ذاکر — خواجہ حیدر علی آتش (ساہتیہ اکادمی)
2. سید عبداللہ — ولی سے اقبال تک
3. محمد حسین آزاد — آب حیات
4. خلیل الرحمٰن اعظمی — مقدمہ کلام آتش

4.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1 آتش کا پورا نام خواجہ حیدر علی تھا۔

2 آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے۔

3 آتش کے پانچ اہم شاگرد ہیں۔نواب مرزا شوق، پنڈت دیا شنکر نسیم، دوست علی خلیل، واجد علی شاہ اختر، خواجہ مجو شریف

4 آتش کا محبوب حیادار اور پارسا ہونے کے علاوہ اپنے عاشق کے دل کا خیال رکھنے والا ہے۔اسی لیے وہ دوسروں سے مختلف ہے۔

5. یگانہ اور فراق آتش سے متاثر ہیں۔

6. دوسرے لوگ ہماری عدم موجودگی میں ہمارے بارے کیا سوچتے ہیں وہی اصل حقیقت ہے۔

7. شاعر کے پاس دنیاوی مال و دولت نہیں اسی لیے اسے اس زمانے کی پرواہ نہیں ہے۔

8. شاعر موت کا انتظار کر رہا ہے۔

9. یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

10. غزل کے پہلے شعر میں شاعر اپنے محبوب کی خوبصورتی کا مقابلہ پھول سے کرنا چاہتا ہے اور محبوب کے حسن کو گل پر فوقیت دینے کی آرزو رکھتا ہے۔

11. شاعر کا ارادہ قاصد کی زبان سے محبوب کو پیغام دینے کا تھا مگر پیمبر نہیں ملا۔اسی لیے شاعر خوش ہے کہ اب وہ خود محبوب کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرے گا۔

12. شاعر اپنی قسمت کی ناسازگاری کی شکایت کرتا ہے یعنی اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی۔اگر وہ بارش کی خواہش کرے تو آسماں سے آگ برسے گی۔

اکائی 5: مومن خاں مومن

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 مومن خاں مومن: حیات

5.4 مومن خاں مومن کی غزل گوئی

5.5 مومن کی غزل (1)

5.5.1 مجموعی تاثر 5.5.2 غزل کی تشریح

5.6 مومن کی غزل (2)

5.6.1 مجموعی تاثر 5.6.2 غزل کی تشریح

5.7 خلاصہ

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

5.9 فرہنگ

5.10 معاون کتابیں

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

5.1 اغراض ومقاصد

زیرنظر اکائی میں حکیم مومن خاں مومن کی حیات اور ان کی غزل گوئی پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جائے گی۔ ان کی شاعری کے امتیازات کو نمایاں کیا جائے گا، تاکہ آپ اس باکمال استاد شاعر کی شاعرانہ عظمت سے کسی قدر واقف

ہوسکیں۔اس اکائی میں آپ کے مطالعہ کے لیے ان کی دو مقبول غزلیں شامل کی گئی ہیں نیز ان غزلوں کے اشعار کی تشریح اور ان کا مجموعی تاثر آسان اور سادہ زبان میں پیش کیا جائے گا تا کہ آپ کو ان کی غزلوں کی تفہیم میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور مومن خاں مومن کی جدت ادا کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

5.2 تمہید

انیسویں صدی کی غزلیہ شاعری میں مومن خاں مومن کا شمار باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔غالب اور ذوق کے اس عہد میں اردو شاعری کو مومن نے ایک نیا مزاج اور نیا آہنگ عطا کیا۔انھوں نے اردو غزل میں عشق کے موضوعات کو وسعت بخشی اور زبان و بیان میں ندرت پیدا کی۔گو کہ ان کی قدر ان کے عہد میں اس طرح نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے لیکن بعد میں اردو دنیا نے ان کے مرتبہ کو محسوس کیا اور ان کی شاعری پر خصوصی توجہ دی۔یہی وجہ ہے کہ مومن کی شاعری کو نظر انداز کر کے انیسویں صدی میں اردو غزل کا مطالعہ ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ اردو غزل کو محبوب پردہ نشیں کا تصور مومن نے ہی دیا تھا اور یہ مومن ہی تھے کہ جنھوں نے اپنی شاعری میں ''مکر شاعرانہ'' جسے اردو کی روایتی شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے کو عروج پر پہونچا دیا۔ذیل میں ہم اردو کے اسی اہم غزل گو شاعر کی حیات اور ان شعری خصوصیات سے متعارف ہوں گے۔

5.3 مومن خاں مومن: حیات

حکیم محمد مومن خاں مومن 1215ھ یعنی 1800ء میں محلّہ کوچہ چیلان، دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق کشمیر کے ایک باعزت خاندان سے تھا۔شاہ عالم کے دور اقتدار میں کشمیر کے دو بھائی حکیم کامدار خاں اور حکیم نامدار خاں دہلی آ کر آباد ہو گئے۔حکیم نامدار خاں کی چار اولادوں میں ایک بیٹی اور تین بیٹے شامل تھے۔ان کے بیٹے حکیم غلام نبی خاں سے حکیم مومن خاں مومن پیدا ہوئے۔گھر والوں نے ان کا نام حبیب اللہ رکھا تھا لیکن بعد میں حضرت شاہ عبدالعزیز نے ان کا نام محمد مومن تجویز کیا اور یہی نام مقبول عام ہوا۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔انھوں نے قرآن بھی حفظ کیا۔ بعد میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں شاہ عبدالقادر کے مدرسہ میں داخل کرایا گیا لیکن وہ عربی

درسیات کو مکمل نہ کر سکے۔ انھیں عربی میں پورا عبور تو حاصل نہ تھا لیکن غالب کے مقابلے ان کی عربی استعداد اچھی تھی اور فارسی میں غالب کے ساتھ صہبائی کے مدمقابل سمجھے جاتے تھے۔ مومن خاں مومن کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ اس لیے مومن کی طب سے وابستگی فطری تھی۔ انھوں نے اپنے والد حکیم غلام نبی خاں اور چچا غلام حیدر خاں سے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اس فن پر انھیں اس قدر دسترس ہوگئی کہ وہ باضابطہ نسخہ نویسی کرنے لگے۔ بعد میں مومن خاں مومن علم نجوم کی طرف بھی راغب ہوئے۔ علم نجوم سے ان کی گہری دلچسپی کا ہی یہ سبب تھا کہ انھوں نے عملیات، رمل، جعفر وغیرہ میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ محمد حسین آزاد نے مومن کی علم نجوم سے وابستگی کا ذکر اپنی کتاب 'آب حیات' میں کیا ہے۔ طب، نجوم، رمل کے علاوہ مومن خاں مومن کے جو دوسرے مشاغل تھے ان میں شطرنج، موسیقی اور ریاضی بطور خاص شامل تھے۔ اس وقت شطرنج اور موسیقی کے ماہرین میں ان کا نام لیا جاتا تھا۔

مومن خاں مومن بہت خوبصورت تھے۔ وہ ہمیشہ ریشمی اور قیمتی کپڑے پہنتے تھے۔ انگرکھا، پاجامہ اور کبھی کبھی برکا پاجامہ پہننے کے شوقین تھے۔ ان کی خوش لباسی مشہور تھی۔ وہ کشیدہ قامت بھی تھے۔ ان کے حلیہ اور لباس کو فرحت اللہ بیگ نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلے حلیہ دیکھیے:

''کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ۔ ان پر لاکھا جما ہوا۔ مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں، سر پر گھونگھرالے لمبے لمبے بال۔'' (آخری یادگار مشاعرہ۔ فرحت اللہ بیگ)

اور اب ان کا لباس دیکھیے:

''بدن پر شربتی ململ کا، نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کا کریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے

ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گل بدن کا پاجامہ، مہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔''

(آخری یادگار مشاعرہ، فرحت اللہ بیگ)

مومن دولت مند کبھی نہیں رہے۔ طب سے ہونے والی کچھ آمدنی سے وہ اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ انھوں نے شاعری کو کبھی وسیلۂ معاش نہیں بنایا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے محدود وظیفہ اور آمدنی کے باوجود اپنے رہن سہن کے انداز کو شاہانہ بنائے رکھا اور کسی کے سامنے کبھی اپنا ہاتھ نہ پھیلایا۔ مومن خاں مومن کی زندگی 'حیات معاشقہ' سے عبارت ہے جو انتہائی دلچسپ ہے۔ محبت ان کی شاعری کا جز لاینفک ہے۔ انھوں نے خوب محبت کی۔ ان کے عشق کی کئی داستانیں ہیں جو ان کی چھ مثنویوں میں مل جاتی ہیں۔ یوں تو ان کی کئی محبوبائیں تھیں لیکن ان میں سے صرف ایک محبوبہ امۃ الفاطمہ بیگم کا ذکر ملتا ہے جو شاعری فرماتی تھیں۔ ان کا تخلص 'صاحب' تھا۔ مومن کی شاعری میں عشق مجازی کا جو رنگ غالب ہے وہ ان ہی سے عشق کا نتیجہ ہے۔

مومن نے دہلی سے باہر کا سفر بھی کیا، جن میں سے رام پور، سہسوان، بدایوں، جہانگیر آباد، سہارن پور، فیروز پور، جھجھر اور سردھنہ کے سفر قابل ذکر ہیں۔ دوستوں سے ملاقات اور جنون عشق کی خاطر انھوں نے یہ سفر کیے۔ ان کی شادی سردھنہ میں عظیم اللہ بیگ کمید کی صاحب زادی سے 1823ء میں ہوئی جو ناکام رہی۔ پہلی شادی سے علاحدگی کے بعد ان کی دوسری شادی خواجہ میر درد کے گھرانے میں انجمن النسا بیگم سے ہوئی جن سے دو اولادیں ایک لڑکی محمدی بیگم اور ایک لڑکا احمد نصیر خاں زندہ رہے اور انہیں دونوں سے مومن خاں مومن کے خاندان میں روشنی پھیلتی رہی۔

مومن نے شاعری کا آغاز کب کیا اس سے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی لیکن کلب علی فائق کے مطابق مومن نو برس کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ آغاز شاعری میں مومن نے شاہ نصیر سے اصلاح سخن لی لیکن زیادہ دنوں تک یہ سلسلہ نہیں چلا۔ وہ خاندان ولی اللہی سے عقیدت رکھتے تھے۔ مسلکاً وہ اہل حدیث تھے۔ وہ ہر مذہب کا احترام تو کرتے تھے لیکن ان کی مذہبی نوک جھونک سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے عقیدہ کا اظہار برملا کیا اور

دوسروں پر بڑی بے باکی سے تنقید بھی کی۔ ان کی شاعری تصوف کے مضامین سے بالکل خالی ہے۔ ان کے پورے کلام میں صوفیانہ افکار نظر نہیں آتے۔

53 برس کی عمر میں مومن اپنے مکان کی چھت سے پھسل کر گر پڑے اور یہی حادثہ ان کی وفات کا سبب بنا۔ ان کا انتقال 1268ھ بمطابق 12 مئی 1853ء کو ہوا۔ 'دیوان اردو'، 'دیوان فارسی' اور 'انشائے مومن' ان کی گراں قدر تصنیفات ہیں۔ 'جان عروض'، 'شرح سدیدی'، 'شرح نفیسی' اور 'رسالہ خواص پان' بھی ان کی تصنیفات میں شامل ہیں، لیکن اب یہ ناپید ہو چکے ہیں۔

اپنے مطالعہ کی جانچ کیجیے:

1. مومن خاں مومن کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. مومن کا پہلے گھریلو نام کیا تھا؟
3. مومن خاں مومن کے خاص مشاغل بتائیے۔

5.4 مومن خاں مومن کی غزل گوئی

مومن خاں مومن تغزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے خود کو تغزل تک محدود رکھا ہے۔ تصوف، اخلاق، فلسفہ اور زندگی کے گوناگوں مسائل کے اظہار سے بڑی حد تک گریز کیا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مومن کی غزلیہ شاعری کی دنیا محدود ہے۔ انھوں نے یوں تو مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل ان کی محبوب صنف سخن رہی جس سے وہ مقبول ہوئے اور ان کے منفرد لب ولہجہ کا تعین ممکن ہو سکا۔ قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور واسوخت میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کی مگر غزل ہی ان کا اصل میدان رہا۔ انھوں نے اپنے محدود دائرے میں رہ کر بھی غزل کو وسعت بخشی اور اپنے فن کا کمال دکھایا۔ تغزل، نازک خیالی، مضمون آفرینی، ندرت اسلوب، داخلیت، سادگی اور مشکل انداز بیان ان کی غزل کے قابل ذکر اجزائے ترکیبی ہیں۔ یوں تو ان کے حوالے سے بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔

انھیں خصوصاً نازک خیال، مضمون آفریں اور مشکل پسند شاعر کہا جاتا ہے لیکن یہ بات پوری طرح درست نہیں، ان کے یہاں پیچیدہ انداز بیان ضرور ملتا ہے، محدود موضوعات بھی ہیں لیکن ان سب کے باوجود مومن ایک منفرد شاعر ہیں۔ اردو شاعری میں جب بھی شعرائے اردو کی بات ہوگی اور ان کے اسالیب بیان کا ذکر ہوگا، مومن کو نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا۔ دراصل مومن کی غزل گوئی کی فہم وادراک کے لیے ایک کشادہ ذہن کی ضرورت ہے۔

مومن کے یہاں عشق کا پہلو سب سے زیادہ غالب ہے۔ ان کی خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی روایت میں پہلی مرتبہ غزل کو صداقت سے آشنا کیا اور اسے سچ بولنا سکھایا۔ اسی لیے ان کی شاعری ان کی آپ بیتی لگتی ہے۔ یہ بھی اُنھی کی خوبی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے غزل میں محبوب کو نسوانی پیکر عطا کیا۔ ان کی محبوبہ گوشت پوست کی عورت تھی۔ اس وقت اس نوع کی آواز بالکل نئی تھی لیکن بعد میں یہ آواز رفتہ رفتہ مانوس ہوتی گئی اور اس سے مومن نے اپنا شاعرانہ انفراد اور امتیاز قائم کرایا۔ یعنی غزل میں محبوب کو تصوراتی پیکر سے نکال کر نسوانی پیکر میں ڈھالنے کا سانچہ بالکل نیا تھا اور مومن کا یہی وہ شاعرانہ وصف ہے جو انھیں ان کے ہم عصروں میں ممیّز کرتا ہے۔

مومن کے یہاں عشق کی مختلف کیفیتیں ملتی ہیں جن میں ایک کیفیت یہ بھی ہے کہ انسان کے دل پر جو کچھ گذرتی ہے اسے وہ بہت خوش اسلوبی سے رقم کرتے ہیں بلکہ دل پر گذرنے والی کیفیتوں سے مومن کے گہرے تجربات اور محسوسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ آیئے چند اشعار اس تعلق سے ملاحظہ کیجیے:

جہاں سے، شکل کو تیری ترس ترس گذرے
جو تجھ پہ بس نہ چلا، اپنے جی پہ بس گذرے

کنجِ قفس میں بیٹھ کے، گاہے روتے ہیں، تنہائی پر
یادِ سیرِ موسمِ گل سے، گاہے جی بہلاتے ہیں

ٹکٹکی لگائی ہے، اب تو اس توقع پر
تا، وہ گر ادھر دیکھیں، مجھ کو دیکھتا دیکھیں

حالِ دل، یار کو، لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

عشق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ مومن کے یہاں عشق مجازی غالب ہے۔ مومن نے اپنی شاعری میں عشق کے کم وبیش تمام موضوعات کو برتا ہے۔ ان کے یہاں تغزل، جمالیاتی ذوق اور جمالیاتی کیفیت

کی ایک الگ ہی فضا قائم ہوتی ہے اور جس سے ان کے شعر وسخن میں ایک دلکش لطف آجاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سمجھتا کیوں کر دیوانے کی باتیں — نہ پایا محرم اپنے رازداں کو
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو — کہ شبِ غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے
سینے پہ ہاتھ دھرتے ہی، کچھ دم پہ بن گئی — لو، جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا
ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

مومن کے یہاں معاملہ بندی کے بہت سے خوبصورت اشعار ملتے ہیں۔ عشق کے اظہار کے لیے معاملہ بندی کا سہارا لینا بہت نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ حسینوں کو چھیڑنے اور وصل وہجر کی باتیں کہنے میں اگر محتاط رویہ نہ اپنایا جائے تو معاملہ بندی کا رشتہ مجازی محبت سے کٹ جاتا ہے اور بوالہوسانہ جذبات سے جڑ جاتا ہے لیکن مومن کو اس فن میں کمال حاصل تھا۔ معاملہ بندی ان کی شاعری کا وصف خاص ہے جس سے وہ بے حد مقبول ومعروف ہوئے۔ ان کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جن سے معاملہ بندی کی خصوصیت واضح ہوتی ہے۔ اس خصوصیت کو ادا شناس ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

کس پہ مرتے ہو، آپ پوچھتے ہیں — مجھے فکرِ جواب نے مارا
شوق وصال دیکھ کر آیا عدو کے گھر — سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر
جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں — جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

مومن کی غزلیہ شاعری کا ایک وصف نازک خیالی بھی ہے جس کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شاعر کو خیال کی نزاکت اور لطافت میں مہارت حاصل ہو اور اس کے لیے اس کی زبان رواں، سلیس اور شیریں بھی ہو۔ نیز معنی میں ندرت پیدا کرنے کی قدرت بھی ہو۔ مومن کو ان چیزوں پر کمال حاصل تھا۔ نازک خیالی میں ان کے اسلوب کی ندرت

دیکھنے کی چیز ہے۔ مومن کا شہرۂ آفاق شعر:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نازک خیالی کی سب سے عمدہ مثال ہے۔ اس شعر میں اس قدر نازک خیالی ہے کہ معنی کی کئی تہیں اجاگر ہوتی ہیں۔ حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نازک خیالی میں مومن غالب سے بھی آگے ہیں جبکہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی مومن کی نازک خیالی کے بارے میں کہتے ہیں:

''مومن بھی غالب کی طرح اپنی انفرادیت لیے ہوئے تھے۔ سنجیدہ معاملہ بندی اور تغزل ان کی غزلوں کا مخصوص جوہر ہے۔ نازک خیالی ان کی شطرنج کے نقشوں کی طرح دقت نظر اور پیچیدگی کی حامل ہوتی ہے۔'' (بحوالہ ہندستانی ادب کے معمار، مومن خاں مومن، ظہیر احمد صدیقی، ص 46)

آیئے چند اشعار اور ملاحظہ کیجیے تاکہ مومن کی نازک خیالی کی تہہ تک پہنچ سکیں:

رحم کر خصمِ جان غیر نہ ہو سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا
ایسے سے کیا درستی پیمان بستہ ہو جو قول دے تو رنگ حنا کا شکستہ ہو
میرے تغیر رنگ کو مت دیکھو تجھے اپنی نظر نہ ہوجائے
جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا وہ کیوں شریک ہو مرے حال تباہ میں

مولانا ضیا احمد بدایونی نے پہلی بار مومن کی شاعری میں 'مکر شاعرانہ' کی خصوصیت کی نشاندہی کی تھی جسے بعد میں اہل نقد ونظر نے خاصی اہمیت دی۔ مومن اپنی اس خصوصیت سے محبوب کو فریب میں ڈال دیتے ہیں۔ 'مکر شاعرانہ' کی خوبی کو اس طرح سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ شاعر کوئی بات کہتا ہے تو بظاہر وہ محبوب کے لیے فائدے مند لگتی ہے لیکن اس کا اصل فائدہ خود شاعر کو ہوتا ہے۔ چند اشعار اس حوالے سے بھی دیکھیے:

تاب کم ظرف کو کہاں تم نے دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجئے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

مومن کے کلام میں سادگی اور نفسیاتی بصیرت کے ساتھ سہلِ ممتنع کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔ سادگی اور پرکاری سے مومن کی شاعری تہہ دار ہو جاتی ہے، نیز نفسیاتی بصیرت سے اور بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے سادگی اور سہلِ ممتنع کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

کہا اس بت سے مرتا ہوں تو مومن　　کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی
اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اور اب نفسیاتی بصیرت کے چند اشعار:

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
دن رات فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک　　میں بھی ذرا آرام لوں، تم بھی ذرا آرام لو

مومن کو زبان و بیان پر بھی گرفت تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو جہاں سادگی، پرکاری، سہل ممتنع سے مالا مال کیا وہیں تشبیہات و استعارات اور صنائع بدائع کے خوبصورت استعمال سے اپنی شاعری کو جلا بخشی۔ یعنی مومن کی فکری بلندی کے ساتھ فنی چابکدستی کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے اور ان کے فن پر سر دھنیے:

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اس جواب میں
کیا کیا شکن دیے ہیں دل زار کو مگر　　اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا
نازک اندام سے لگی ہے آنکھ　　حسرت فرش خواب نے مارا

مومن لفظی و معنوی رعایات و مناسبات سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لفظی و معنوی رعایات و مناسبات کا استعمال کیا جائے اور اس کی مختلف شکلوں کو بیان کیا جائے۔ مومن اپنے اشعار میں قاری کو حیرت و استعجاب اور مغالطے میں ڈال دیتے ہیں جو انھیں کا حصہ ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے بیان میں بہت ہوشیاری سے کام لیتے ہیں، یہ ہنر سب کو نصیب نہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل بھی اپنا پھر گیا　　یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو　　ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

جی ہی مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا　　پانو کیا کوچے سے اس ہوش ربا کے اٹھے

مارے خوشی کے مر گئے صبحِ شبِ فراق　　کتنے سبک ہوئے ہیں، گراں جانیوں میں ہم

عاشقانہ تجربات ومحسوسات کے ساتھ مومن نے اپنی شاعری میں مذہبی تلازموں کا بھی سہارا لیا اور شاہکار اشعار کہے۔ ایک شاعر کے لیے یہ بڑی بات ہے کہ وہ مذہبی تلازموں کو برت کر ایک خاص انداز پیدا کر لے۔ مومن اس معاملے میں اپنی ذہانت و فطانت کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت کم شاعروں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غیر مناسب نہیں کہ ان کی غزل گوئی کا یہ ایک خاص جز وانھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

واعظ کے ذکرِ مہرِ قیامت کو کیا کہوں　　عالم شبِ وصال کے آنکھوں میں چھا گئے

جنبشِ نرگسِ جنت نے رلایا مومن　　چشمِ کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

وصلِ بتاں کے دن تو نہیں یہ، کہ ہو وبال　　مومن، نماز قصر کریں کیوں، سفر میں ہم

واعظ بتوں کو خلد میں لے جائیں گے کہیں　　ہے وعدہ کافروں سے، 'عذابِ الیم' کا

مومن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے تخلص کے استعمال میں یکتا شاعر ہیں۔ وہ اپنے تخلص کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تخلص کی معنویت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اشعار میں وہ اس طرح تخلص کو برتتے ہیں کہ دوسرے الفاظ اسی سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ مومن کے چند خوبصورت مقطعے ملاحظہ کیجیے جن سے تخلص کا حسن بڑھ جاتا ہے:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر　　مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

کیوں سنے عرض مضطرب مومن　　صنم آخر خدا نہیں ہوتا

مومن کو سچ ہے دولت دنیا و دیں نصیب　　شب بت کدے میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مومن کی غزل گوئی نہ تو سپاٹ ہے اور نہ بے کیف بلکہ اس میں تہہ داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور پوری شاعری میں مخصوص قسم کی سنجیدگی، نظم وضبط، رکھ رکھاؤ اور تمکنت موجود ہے۔ ان کے یہاں معاملہ بندی بھی پروقار انداز میں ملتی ہے اور تجربات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ نیز ان کی فکر میں جو تازگی اور طرفگی ہے وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ان کے لفظی ومعنوی تلازمات وانسلاکات میں بہت توانائی ہے جس سے ان کے فنی کمالات اجاگر ہوتے ہیں۔ عاشق، محبوب اور رقیب کے ساتھ بہت خوش اسلوبی سے انھوں نے نباہ کیا ہے لیکن کہیں کہیں پیچیدگی اور الجھاؤ سے اشعار کو سمجھنے میں ضرور دقت پیدا ہوتی ہے۔ اس کمی کے باوجود مومن ایک دلچسپ اور مخصوص رنگ کے شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے طرز بیان، طرز اسلوب، فکر کی بلندی اور فن کی پختگی سے واضح ہوجاتی ہے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جو انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

اپنے مطالعہ کی جانچ کیجیے:

4　مومن کی غزل گوئی کا بنیادی موضوع کیا ہے؟

5　مومن کی غزل کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

6　مومن کی شاعری میں 'مکر شاعرانہ' کی خصوصیت کی نشاندہی پہلی بار کس نے کی؟

5.5 مومن کی غزل (1)

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر　　ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطرب مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا

5.5.1 مجموعی تاثر

مومن کی یہ بے حد مقبول غزل ہے جس کے مطالعہ سے ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس غزل میں مومن کی نازک خیالی اور نازک خیالی میں ندرت اسلوب اور شاعرانہ شوخی سب کچھ شامل ہے جو انھیں کا وصف خاص ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مومن کی غزل گوئی کے جتنے بھی اجزائے ترکیبی ہیں وہ سب اس غزل میں موجود ہیں۔ تغزل، سادگی، نظر فریبی، دقت پسندی اور داخلیت کی مثالیں اس ایک غزل میں ہی مل جاتی ہیں۔ فکری وفنی پختگی کے عمدہ نمونے بھی اس میں مل جاتے ہیں۔ یہ غزل مومن کے عاشقانہ مزاج کی عکاس بھی ہے۔ گویا یہ کہنا مناسب ہے کہ مومن نے عام روش سے ہٹ کر جو شاعری کی اس کی یہ عمدہ مثال ہے۔ اس غزل سے شاعر کی منفرد راہ بنانے کی خواہش تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اس غزل میں اتنی توانائی ہے کہ اس ایک غزل سے ہی مومن کی شاعرانہ قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

5.5.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: اس شعر (مطلع) میں شاعر کہتا ہے کہ اسے جو رنج وغم ہے اس کا اثر اس کے محبوب پر ذرا بھی نہیں ہے۔ محبوب نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ وہ میری پریشانیوں سے آگاہی کے باوجود مجھ پر کرم فرمائیاں نہیں کرتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ رنج سے راحت ملتی ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ رنج راحت فزا نہیں ہوتا۔ رنج تو رنج ہے اس سے خوشی، مسرت اور آرام سب چھن جاتا ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کو ہی اپنی غزل کی معراج سمجھتا ہے۔ اس کی نظر میں اس کا محبوب ہی اس کی دنیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب کسی طور بھی میرا نہیں ہوا۔ اگر وہ میرا ہو جاتا اور مجھ پر اس کی عنایتوں کی بارش ہو جاتی تو دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ یعنی محبوب کی بے وفائی کے سبب ہی عاشق کی دنیا اداس اور بے رنگ ہو گئی ہے۔

تیسرا شعر: مومن کا یہ شہرۂ آفاق شعر ہے جو زبان زد خاص و عام ہے، غالب اس شعر سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھیں کہنا پڑا کہ اگر مومن یہ شعر مجھے دے دیں تو اس کے بدلے میں میں انھیں اپنا پورا دیوان دے سکتا ہوں۔ اس شعر کی تشریح مختلف لوگوں نے مختلف انداز میں کی ہے۔ نازک خیالی کا یہ ایک عمدہ شعر ہے۔ جس میں شاعر کہتا ہے کہ جب میرے پاس میرا محبوب ہوتا ہے اس وقت میرے تصور میں کوئی دوسرا شخص نہیں ہوتا۔ یعنی جب شاعر تنہا ہوتا ہے اور اس کے تصور میں اس کے محبوب کا کوئی تصور ہوتا ہے تب کوئی دوسرا اس کے پاس موجود نہیں ہوتا۔

چوتھا شعر: یہ شعر بھی دوسرے اشعار کی طرح سہل اور آسان ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے دل کے حال کو کس طرح رقم کروں، میرا ہاتھ دل سے کبھی جدا ہی نہیں ہوتا۔ یعنی دل اس قدر بے حال ہے اور دھڑک رہا ہے کہ ایسا لگتا ہے کبھی بھی کچھ ہوسکتا ہے، لہٰذا وہ دل کا حال رقم نہیں کرسکتا۔ دوسرے لفظوں میں شاعر نے اپنے ہاتھ سے دل کو تھام رکھا ہے اور جب ایسی صورت ہے تو کس طرح اور کیوں کر وہ اپنے محبوب کو اپنا حال دل لکھے۔ یہ اس کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ یہ دل قابو میں آئے تبھی وہ یار کو دل کی بات لکھ سکے گا۔

پانچواں شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ دل کا علاج صبر و تحمل ہے۔ اس کے بغیر دل کا علاج ممکن ہی نہیں اور یہ صبر محبوب کی بدولت ہی ہوتا ہے لیکن اس کی بے مروتی کے سبب صبر نہیں اور یہی وجہ ہے کہ دل سکون سے عاری ہے۔ گویا محبوب کی الفت و محبت کے حاصل ہوتے ہی دل کا مرض کم ہو جائے گا اور اسے سکون نصیب ہوگا۔

چھٹا شعر: مقطع میں شاعر کہتا ہے کہ مومن کی بے چینی و بے قراری کو اس کا صنم کیوں کر سُنے۔ وہ کیونکر اس کی تکلیف کو دور کرنے کی بات سوچے۔ صنم تو آخر صنم ہی ہوتا ہے۔ یعنی معشوق تو آخر معشوق ہی ہوتا ہے وہ بھلا کیوں کر خدا ہو جائے۔ وہ خدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا کام ہی پریشان اور بے چین کرنا ہے، ستانا ہے، چنانچہ صنم سے یہ توقع کرنا کہ وہ اس کی بے قراری اور بے چینی کی کیفیت کو محسوس کرے یا اس کے درد کو سنے، فضول ہے۔

اپنے مطالعہ کی جانچ کیجیے:

7 اس غزل سے شاعر کو فنی سطح پر کیا حاصل ہوتا ہے؟

8 تیسرے شعر کے بارے میں غالب نے کیا کہا تھا؟

5.6 مومن کی غزل (2)

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو — وہی، یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گِلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب کے جو روبرو، تو اشارتوں ہی میں گفتگو — وہ بیان، شوق کا برملا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی، کہ تمھارے جی کو بُری لگی — تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گِنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا — میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمھیں یاد ہو، کہ نہ یاد ہو

5.6.1 مجموعی تاثر

مومن کی یہ غزل بھی ان کی مقبول ترین غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس غزل سے شاعر کی یادوں کا جمالیاتی خزانہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ شاعر کے جو اپنے عاشقانہ تجربات ومحسوسات ہیں ان کی تصویر کشی اس غزل میں بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ گویا جذبات نگاری کی اتنی دل کش تصویر کشی کم شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ پوری غزل جذبات نگاری کی عمدہ مثال ہے جس سے شاعر کے ذہن میں وہ تمام باتیں رقص کرنے لگتی ہیں جو محبوب سے وابستہ ہیں۔ یادوں کا جو سیلاب محبوب سے وابستہ ہے وہ عاشق کے سوئے ہوئے جذبات کو جگا رہا ہے اور شاعر یہ توقع کرتا ہے کہ اس کے محبوب کے جذبات بھی ضرور بیدار ہوں گے۔ یہ غزل مومن کی عشقیہ کیفیت کو پوری آب وتاب کے ساتھ بیان کرتی ہے اور اپنا ایک الگ تاثر قائم کرتی ہے۔ اس غزل سے مومن پر محبوب کی عنایتوں کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ نیز مومن کی غزل گوئی کی لفظیات اور زبان وبیان کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

5.6.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: اس شعر (مطلع) میں شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کبھی ہم نے اور تم نے ایک

ساتھ جینے اور مرنے کا عہد کیا تھا یعنی دونوں نے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے اور ساتھ ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ہم نے اپنے وعدوں کو نباہنے کا اقرار بھی کیا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے یاد ہیں تمھیں یاد ہے کہ نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ گویا شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر اپنے ماضی کی یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ محبوب کے لطف و کرم سے وہ سرشار تھا۔ محبوب کی عنایتیں اس پر خوب تھیں اور اس کے حال پر محبوب کو ترس بھی آتا تھا لیکن اب وہ دن نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اب نہ محبوب کی وہ کرم فرمائیاں رہیں اور نہ وہ عنایتیں، جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ شاعر کو گزری ہوئی یہ تمام باتیں ذرا ذرا ہی سہی یاد ہیں لیکن اس کے محبوب کو یہ باتیں اب یاد ہیں کہ نہیں یا اس کے ذہن سے نکل گئیں، اس سے وہ ناواقف ہے۔

تیسرا شعر: شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کو یاد دلاتا ہے کہ جب ہم دونوں ملتے تھے تو تم نئے نئے گلے شکوے کرتے تھے اور مزے مزے کی باتیں بھی۔ تم مجھ سے بات بات پر روٹھ بھی جاتے تھے اور میں خوش دلی سے تمھیں مناتا بھی تھا۔ یہ سب مجھے یاد ہے تمھیں یاد ہے یا نہیں اس کی مجھے خبر نہیں۔

چوتھا شعر: شاعر اس شعر میں بھی ماضی کی یادوں کو ٹٹولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم کبھی سب کے روبرو بیٹھتے تھے اور کھل کر باتیں کرنے کا ہمیں موقع نہیں ملتا تھا تو اشاروں میں ہی گفتگو کیا کرتے تھے جس سے ایک دوسرے کی باتوں کی ترسیل بھی آسانی سے ہو جاتی تھی۔ ہم خواہش کا برملا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ یہ سب باتیں اب تک ذہن نشیں ہیں۔ تمھارے ذہن و دل میں یہ باتیں ہیں یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ اب بھی اسی طرح اسے چاہتا ہے جیسے پہلے کبھی چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دل میں بے وفا محبوب کے لیے اب بھی جگہ باقی ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کی خصوصیت بیان کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے محبوب کا دل بہت بڑا ہے۔ کیونکہ اس سے جب کبھی کوئی غلطی ہو جاتی تھی یا اس کی کسی بات سے محبوب کا دل دکھتا تھا تو وہ اسے دل پر نہیں لیتا تھا بلکہ بہت جلد اسے فراموش کر دیتا تھا یعنی اسے بھول جاتا تھا۔ محبوب کی یہ دریا دلی شاعر کو اب بھی یاد ہے،

لیکن دوسری طرف اس کے پردے میں وہ یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ جو محبوب اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بیان سے پہلے ہی درگزر کر دیتا تھا، روٹھتا ضرور تھا لیکن پھر مان جاتا تھا، نہ جانے اب کیوں اتنا خفا ہو گیا کہ پہلے جیسا نہیں رہا اور جس سے اس کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ شاعر ماضی کی اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے محبوب سے مخاطب ہے کہ مجھے تمھاری ہر بات یاد ہے تمھیں یاد ہے کہ نہیں، ذرا مجھے بتا دو کہ دل کو اطمینان ہو۔

چھٹا شعر: اس شعر میں شاعر محبوب سے اپنے سابقہ رشتے کا ذکر کر رہا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو یاد دلاتا ہے کہ کبھی ہم دونوں میں بہت گہری دوستی تھی، محبت تھی، راہ و رسم تھی، کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے تھے۔ یہ سب باتیں مجھے تو یاد ہیں تمھیں یاد ہے یا نہیں اس کی خبر نہیں۔ گویا شاعر نے اس شعر میں اپنے جذبات کا اظہار بڑی محبت سے کیا ہے۔

ساتواں شعر: یہ مقطع ہے، جس میں مومن نے بڑی خوبصورتی سے اپنے تخلص کا استعمال بھی کیا ہے۔ شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ جسے تم اپنا سب کچھ سمجھتے تھے، اپنی دنیا سمجھتے تھے، اپنا شناسا سمجھتے تھے، جسے تم باوفا، خیر خواہ، قول کا سچا قرار دیتے تھے یہ اچانک تمھیں کیا ہوا کہ وہی مومن پریشانی میں مبتلا ہے اور تم خبر تک نہیں لیتے۔ میں آج بھی وہی مومن ہوں جو پہلے تمھارا مومن تھا، تم ان باتوں کو بھول بیٹھے ہو یا یاد ہے، مجھے اس کا پتہ نہیں لیکن میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مجھے وہ تمام باتیں آج تک یاد ہیں۔ اس شعر میں شتر گربہ بھی ہے۔ پہلے مصرعے میں شاعر نے محبوب کو 'آپ' کہہ کر مخاطب کیا ہے تو دوسرے مصرعے میں 'تمھیں' کہا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. غزل (2) کا موضوع کیا ہے؟
10. غزل (2) مومن کی کس کیفیت کو آب و تاب کے ساتھ پیش کرتی ہے؟

5.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے انیسویں صدی کے ایک اہم اور باکمال شاعر مومن خاں مومن کی حیات اور ان کی

غزل گوئی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا نیز مختلف گوشوں کو اجاگر بھی کیا ہے۔ مومن کی تعلیم اور ان کے مشاغل اور ان کے حلیے اور لباس کا ذکر بھی اس اکائی میں کیا ہے۔ وہ 1800ء میں محلّہ کوچہ چیلان دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ قرآن بھی حفظ کیا۔ بعد میں عربی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ خاندانی پیشہ طب سے وابستہ رہے، علم نجوم سے بھی ان کی گہری دلچسپی رہی، وہ بہت شوقین بھی تھے۔ ہمیشہ خوبصورت کپڑے پہنتے تھے، ان کے عشق کی بہت سی داستانیں بھی مشہور ہوئیں۔ ان کی شاعری عشق مجازی سے بھری پڑی ہے۔ انھوں نے دہلی سے باہر کا بھی سفر کیا۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ وہ خاندان ولی اللہی سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مسلک سے اہل حدیث تھے۔ ان کی مذہبی نوک جھونک سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری تصوف کے مضامین سے خالی ہے۔ 53 برس کی عمر میں وہ اپنے مکان کی چھت سے گر پڑے اور زخمی ہو گئے۔ یہی حادثہ ان کی موت کا سبب بنا۔ ان کا انتقال 12 مئی 1853ء کو ہوا۔ 'دیوان اردو'، 'دیوان فارسی' اور 'انشائے مومن' ان کی قابل قدر کتابیں ہیں۔

اس اکائی میں مومن خاں مومن کی غزلیہ شاعری کی قابل ذکر خصوصیات اور بنیادی شعری کائنات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی غزل گوئی کے اجزائے ترکیبی کو بیان کیا گیا ہے جن سے اس عہد کی شاعری میں ان کی انفرادیت واضح ہو جاتی ہے۔ مومن نے ذوق کی طرح سپاٹ اور اکہری شاعری نہیں کی، جرأت کی طرح چوماچاٹی کی شاعری سے پرہیز کیا۔ انشا کی روش سے دور رہے اور اپنی راہ بالکل الگ بنائی۔

انہوں نے پہلی بار محبوب کے نسوانی تصور کو غزل میں پیش کیا۔ مومن نے مذہبی تلازمات کو بھی غزل میں برتا۔ ان کی غزلیں سہیل ممتنع، نازک خیالی اور معاملہ بندی کی اچھی مثالیں ہیں۔ مکر شاعرانہ اور اپنے تخلص کا برمحل و باموقع استعمال ان کی شاعری کی دوسری اہم خصوصیت ہے۔

اس اکائی میں مومن کی دو مقبول غزلوں کے منتخب اشعار بطور نمونہ پیش کیے گئے اور ان غزلوں کے اشعار کی تشریح بھی کی گئی اور ان کا خلاصہ بھی درج کیا گیا تاکہ طلبا و طالبات کو اشعار سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مومن کی یہ دونوں غزلیں بے انتہا مشہور ہیں اور ان شاعرانہ خصوصیات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں جن کے لیے مومن کی

شاعری جانی جاتی ہے۔ مومن کی شخصیت اور ان کی شاعری پر اظہار خیال کے ساتھ ہی اپنے مطالعہ کی جانچ کے ساتھ امتحانی سوالات بھی دیے گئے نیز مختصر سوالات کے جوابات بھی موجود ہیں۔ کچھ مشکل الفاظ کے معنی بھی فرہنگ میں شامل ہیں۔ آخر میں مومن کی زندگی اور شاعری سے متعلق مزید معلومات میں اضافہ کے لیے کچھ منتخب کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ان معاون کتابوں سے مطالعہ میں گہرائی پیدا ہو سکے گی اور مومن کی قدر و قیمت کے تعین میں آسانی بھی ہوگی۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1۔ مومن کی تعلیم، خاندان اور ان کی طب سے وابستگی کے بارے میں کچھ بتائیے۔

2۔ مومن کے حلیہ اور لباس پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مومن کی حیات معاشقہ اور دہلی سے باہر کے سفر سے متعلق معلومات فراہم کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں لکھیے۔

1۔ مومن خاں مومن کی مختصر سوانح حیات بیان کیجیے۔

2۔ مومن خاں مومن کی عشقیہ شاعری پر گفتگو کیجیے۔

3۔ مومن خاں مومن کی غزل گوئی کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

5.9 فرہنگ

الفاظ	معانی	الفاظ	معانی
خشخاش	پوست کے دانے، چاول کا آٹھواں حصّہ	انگرکھا	ایک قسم کا مردانہ لباس، لبادہ
پیکر	چہرہ، شکل، صورت	ممیّز	تمیز کیا گیا، پہچانا گیا

کنجِ قفس	پنجرے کا کونا	وصال	ملاقات، وصل
خصمِ جان	جان کا دشمن	شبِ ہجر	جدائی کی رات
عدو	دشمن، مخالف، رقیب	دربان	چوکیدار، پہرے دار
بصیرت	بینائی، دانائی	شکن	توڑنے والا، سلوٹ، بھول
نازک اندام	نازک جسم والا	استعجاب	تعجب، حیرانی
کفِ پا	پاؤں کا تلوا	تلازمہ	مضمون کی رعایت سے الفاظ کا استعمال
نرگس	ایک پھول	واعظ	وعظ کہنے والا
عذابِ الیم	سخت عذاب	سبک	ہلکا، نازک

مطلع غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف وقافیہ ہوتے ہیں۔

مقطع غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

5.10 معاون کتابیں

1۔ مقدمہ دیوان مومن۔ ضیاء احمد بدایونی

2۔ حیات مومن ضیاء احمد بدایونی

3۔ مومن خاں مومن ظہیر احمد صدیقی

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1۔ مومن خاں مومن 1215ھ مطابق 1800ء میں کوچہ چیلان، دہلی میں پیدا ہوئے۔

2۔ مومن کا پہلے گھریلو نام حبیب اللہ تھا۔

3۔ طب، نجوم، رمل، شطرنج اور موسیقی مومن کے خاص مشاغل تھے۔

4۔ مومن کی غزل گوئی کا بنیادی موضوع عشق مجازی ہے۔

5۔ تغزل، نازک خیالی، مضمون آفرینی، ندرت اسلوب، داخلیت، سادگی، مکر شاعرانہ اور مشکل انداز بیان مومن کی غزل کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

6۔ مولانا ضیا احمد بدایونی نے مومن کی شاعری میں مکر شاعرانہ کی پہلی بار نشاندہی کی۔

7- شاعر کی منفرد راہ بنانے کی خواہش تکمیل تک پہونچتی ہے۔

8- اگر مومن یہ شعر مجھے دیدیں تو بدلے میں میں اپنا پورا دیوان دے سکتا ہوں۔

9- غزل (2) کا موضوع محبوب سے متعلق وہ یادیں ہیں جو شاعر کے دل و دماغ میں ابھی بھی تازہ ہیں۔

10- عشقیہ کیفیت کو آب و تاب کے ساتھ پیش کرتی ہے؟

اکائی 6: اسداللہ خاں غالب

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 مرزا غالب: حیات

6.4 مرزا غالب کی غزل گوئی

6.5 مرزا غالب کی غزل (1)

6.5.1 مجموعی تاثر 6.5.2 غزل کی تشریح

6.6 مرزا غالب کی غزل (2)

6.6.1 مجموعی تاثر 6.6.2 غزل کی تشریح

6.7 خلاصہ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.9 فرہنگ

6.10 معاون کتابیں

6.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

6.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی حیات پر مختصراً روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کو بطور خاص اجاگر کیا جائے گا تاکہ آپ ان کی تخلیقی بصیرت اور شاعرانہ صلاحیت دونوں سے آگاہ ہوسکیں۔ اکائی میں

آپ کے مطالعہ کے لیے غالب کی دو معروف و مقبول غزلوں کے منتخب اشعار بھی پیش کیے جائیں گے اور ان منتخب اشعار کی تشریح بھی مختصر طور پر کی جائے گی نیز ان پر مجموعی تاثر کا اظہار بھی کیا جائے گا۔ آخر میں پوری اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا جس سے غالب کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

6.2 تمہید

مرزا غالب اردو شاعری کا اہم اور بڑا نام ہے۔ اُنھوں نے اردو غزل کو ایک نئے جہان معنی سے آشنا کیا اور آبرو بخشی۔ ان کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ ان کے قدر دان ہر نسل اور ہر زمانے میں رہے ہیں اور ان کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا تھا کہ ہندوستان میں دو ہی الہامی کتابیں ہیں، ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں ہر عہد اور ہر زمانے کی تسکین کا سامان موجود ہے۔ غالب کے مطالعہ کے بغیر اردو شاعری ادھوری ہے۔ آپ غالب کی حیات اور ان کی شاعری میں ایک نئی زندگی ڈھونڈنے پر مجبور ہو جائیں گے اور آپ کو ان کا کلام بہت متاثر کرے گا۔

6.3 مرزا غالب: حیات

مرزا غالب 27/دسمبر 1797 (8/رجب 1212ھ) کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصلی نام مرزا اسداللہ خاں تھا۔ جبکہ عرف مرزا نوشہ اور خطاب 'نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ' تھا۔ ان کے خاندان کا شمار متمول گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا عبیداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ اُنہی کے بطن سے مرزا غالب پیدا ہوئے۔ ابھی غالب صرف پانچ برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ایک جنگ میں مارے گئے۔ والد کے گزر جانے کے بعد مرزا کی پرورش و پرداخت ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے کی لیکن جب ان کی عمر نو برس کی ہوئی تو چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد نانا نے مرزا غالب کی دیکھ ریکھ کی۔ پھر نواب احمد بخش خاں نے مرزا کے خاندان کے لیے انگریز حکومت سے وظیفہ دلوایا۔ اس طرح مرزا کی زندگی کسی طرح پٹری پر آئی۔

مرزا غالب نے اپنی ابتدائی تعلیم آگرے میں مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ مولوی معظم نے انھیں عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ جب مرزا کی عمر چودہ برس کی تھی اس وقت ایک ایرانی عالم ملا عبدالصمد بغرض سیر و سیاحت آگرہ وارد ہوا۔ انھوں نے دو برس تک اس ایرانی عالم سے درس لیا۔ لیکن اس ایرانی عالم سے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ محض افسانہ طرازی معلوم ہوتی ہیں۔ مرزا کی تحریروں سے اس بات کی تردید ہو جاتی ہے۔ شاید انھوں نے یہ نام اس لیے لیا ہوگا کہ وہ بے استاد نہ کہے جائیں۔ مرزا کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنی ایک فارسی غزل اپنے استاد مولوی معظم کو اصلاح کے لیے اس وقت دی جب ان کی عمر مشکل سے دس برس ہوگی۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالب شادی کے دو برس بعد یعنی 1812 میں اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر دہلی آ گئے۔ بیوی عبادت گزار تھی جبکہ مرزا رند بلانوش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میاں اور بیوی کا مزاج مختلف تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ غالب کے اپنی بیوی سے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ مرزا کی سات اولادیں ہوئیں لیکن ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہی۔ بعد میں مرزا نے امراؤ بیگم کے بھانجے زین العابدین عارف کو گود لے لیا۔

غالب کے آبا و اجداد سنی تھے لیکن غالب نے ایک دو خطوں میں اپنے اثنا عشری ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس بات پر بعض محققین کو بھروسہ نہیں۔ ان کے مطابق مرزا ہمیشہ مخاطب کو خوش کرنے کے لیے دلچسپ بیان دے دیتے تھے۔ وہ دراصل اعتدال پسند تھے اور کھلا ذہن رکھتے تھے۔ انسانیت کے قدر دان تھے، ان کو کسی بھی مسلک اور عقیدے سے اختلاف نہیں تھا۔ ان کے حلقے میں شیعہ، سنی، ہندو، مسلمان اور عیسائی سبھی شامل تھے۔

غالب ہمیشہ مالی دشواریوں میں گھرے رہے۔ مختصر آمدنی سے زندگی کاٹنا مشکل تھا اس لیے وہ سودی قرض میں دبے رہے۔ پنشن بند ہونے کے بعد وہ قرض دار ہو گئے۔ مالی حالت سدھارنے کی غرض سے انھوں نے دور دراز کے سفر بھی کیے۔ پنشن میں اضافہ کے مقصد سے انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا۔ وہ دو بار رام پور بھی گئے مگر انھیں کامیابی نہیں ملی۔ ایک دفعہ قمار بازی کے الزام میں پکڑے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کے مکان میں امیر زادے شرط لگا کر چوسر

اور شطرنج کھیلتے تھے۔ اس سے غالب کو کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن اس الزام میں غالب گرفتار ہوئے اور اُنہیں سزا بھی ہوئی۔ یہ ایسا داغ تھا جس نے زندگی بھر انھیں شرمسار کیے رکھا۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ انھوں نے جسم کے کپڑے بیچ کر گزر بسر کی۔ تاہم غالب کا یہ کمال تھا کہ انھوں نے تمام مشکلات کو ہنس کر برداشت کیا۔

غدر 1857 میں دہلی میں تباہی کا طوفان مچا۔ غالب بھی اس کا شکار ہوئے۔ ان کا مال و اسباب لٹ گیا اور ذہنی سکون بھی چلا گیا۔ دلی کی تباہی و بربادی کا غم غالب کو زندگی بھر رہا۔ انھوں نے اپنے بہت سارے خطوط میں دلی کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ غالب اس زمانہ میں بلی ماران میں رہتے تھے۔ اس ہنگامہ میں منشی ہرگوپال تفتہ اور لالہ مہیش داس نے ان کی مالی امداد کی۔

مرزا کی صحت 1866 سے خراب رہنے لگی تھی۔ ان کی زندگی کے آخری ایام بہت صبر آزما تھے۔ غربت، تنگ دستی اور بیماری نے انھیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان پر قولنج کے دورے پڑتے تھے۔ بڑھاپے میں بینائی بھی کمزور ہوگئی تھی۔ کان سے ایک طرح سے بہرے ہو چکے تھے، حافظہ خراب اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ شراب نوشی کے شدید اثرات بڑھاپے میں دیکھنے کو ملے۔ انھیں بھوک نہیں لگتی تھی اور جسم پر پھوڑے بھی نکل آئے تھے، اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا، گویا زندگی کے آخری دنوں میں انھیں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ انتقال سے چند روز پہلے ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی، دماغ پر فالج گرا تھا، دواؤں سے حالت بہتر نہ ہوئی اور اسی بے ہوشی میں 15 فروری 1869 کو اس عظیم شاعر کا انتقال ہو گیا۔ انھیں درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے نزدیک خاندان لوہارو کے قبرستان میں دفن کیا گیا جو اس وقت غالب اکیڈمی سے متصل ہے۔

مرزا نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں درجنوں تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جو انھیں شہرت دوام بخشتی ہیں۔ یہ تصانیف فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بیش بہا خزانے ہیں۔ فارسی نثر میں 'پنج آہنگ'، 'مہر نیم روز'، 'دستنبو'، 'قاطع برہان'، 'درفش کاویانی' اور فارسی شاعری میں 'دیوان فارسی'، سبد چین، سبد باغ دودر، دعائے صباح، متفرقات غالب، مآثر غالب تصنیفات قابل ذکر ہیں۔ جبکہ اردو شاعری میں 'دیوان اردو' اور اردو نثر میں 'عود ہندی'، 'اردوئے معلیٰ'،

'مکاتیب غالب'، 'نادرات غالب'، 'نکاتِ غالب'، 'رقعات غالب'، قادر نامہ، انتخاب غالب، نامۂ غالب اور تیغ و تیز تصانیف گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ صرف غالب کے اردو دیوان سے متعلق یہ اطلاعات ملتی ہیں کہ ان کا اردو دیوان ان کی زندگی میں چھ بار چھپا۔ پہلی بار 1841 میں سید المطابع دہلی سے، دوسری بار 1847 میں مطبع دارالسلام دہلی سے، تیسری بار 1861 میں مطبع احمدی دہلی سے، چوتھی بار 1862 میں مطبع نظامی کانپور سے، پانچویں بار 1862 میں ہی مومن و ذوق کے دواوین کے ساتھ مطبع احمدی دہلی سے اور چھٹی بار 1863 میں مطبع شیونرائن آگرہ سے شائع ہوا جبکہ غالب کی وفات کے بعد ان کے اردو دیوان کے کئی ایڈیشن چھپے جن میں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی، گُلِ رعنا، مرقعِ چغتائی، نقشِ چغتائی، دیوانِ مصور از صادقین اور نسخۂ عرشی زادہ قابل ذکر ہیں۔

اپنے مطالعہ کی جانچ کیجیے:

1۔ مرزا غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے اور ان کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

2۔ غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں کتنی بار چھپا؟

3۔ غالب کی وفات کے بعد ان کے اردو دیوان کے جو قابل ذکر ایڈیشن شائع ہوئے ان کے نام بتائیے؟

6.4 مرزا غالب کی غزل گوئی

اردو شاعری میں غالب کا کوئی ثانی نہیں۔ غالب جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس عظیم شاعر کی بدولت اردو شاعری معراج کو پہنچتی ہے۔ انھوں نے فارسی میں شاعری کی۔ غزلیں، قصائد، قطعات اور رباعیات کہیں لیکن انھیں اردو غزلوں سے شہرت دوام نصیب ہوئی۔ البتہ ان کے خطوط سے ان کی مقبولیت میں ضرور چار چاند لگے۔ زمانہ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غالب کو ان کی زندگی میں وہ مقام و مرتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اسی لیے انھیں ساری عمر یہ شکایت رہی کہ مدح کا صلہ نہ ملا۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا۔ غزل کی داد کو وہ ترستے رہے۔ قدر ناشناسی سے ان کا مزاج تلخ ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ ان کے کلام میں مشکل پسندی کے سبب ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب انھوں نے سہل اور آسان شعر کہنا شروع کیا تو ان کی شاعری سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ غالب اور ذوق کی معرکہ آرائی

سے بھلا کون واقف نہیں۔ غالب جو ایک نابغۂ روزگار، یکتائے فن اور پیغمبرِ سخن تھے، ان کے آگے ذوق کے مداحوں کی ایک نہ چلی اور غالب ہمیشہ ملکِ سخن کے بے تاج بادشاہ ثابت ہوئے۔

غالب کی زندگی کا ایک بڑا حصہ مشکلات میں گزرا۔ اس لیے ان کی شاعری میں مایوسی اور افسردگی کا رنگ پیدا ہوا لیکن انھوں نے تمام مصائب کا مقابلہ بڑی دلیری کے ساتھ کیا۔ شاید اسی لیے ان کا کلام قنوطیت سے پاک ہے۔ وہ بہت ذہین فن کار تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے فنی نقائص اور عیوب پر غور فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسے ماہرین فن سے مشورے لے کر ان پر عمل کرتے رہے۔ نتیجتاً ان کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں پیدا ہوگئیں جو ایک عہد آفریں شاعر میں ہوتی ہیں۔ اگر ان کے کلام پر غور و فکر کیا جائے تو چار قسم کے اشعار ان کے یہاں کثرت سے مل جاتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار اتنے مشکل اور پیچیدہ ہیں کہ انھیں سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار میں لفظوں کا طلسم نظر آتا ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ ان کے بہت سے اشعار میں انداز بیان دلکش اور مضمون آفرینی ملتی ہے جو انہی کا حصہ ہے۔ چوتھی قسم ان کے اشعار کی یہ ہے کہ وہ اپنے شعروں سے تیر و نشتر کا کام لیتے ہیں۔ ایسے اشعار میں بندش کی دلکشی، خیالات میں تازگی اور رنگارنگی ملتی ہے۔

غالب نے اپنی فارسی شاعری میں بیدل، ظہوری، عرفی، نظیری وغیرہ کی تقلید کی جبکہ اردو میں ناسخ کی پیروی کی لیکن ہمیشہ انھوں نے اپنی انفرادیت کی راہ الگ نکالی۔ شیخ محمد اکرام نے غالب کی شاعری کے پانچ ادوار قرار دیے ہیں۔ ان کے مطابق پہلا دور ابتدا تا 1821ء ہے جس میں انھوں نے فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب کا استعمال کثرت سے کیا۔ شعر کو مشکل اور پیچیدہ بنا کر پیش کیا۔ اس دور کے اکثر و بیشتر اشعار شعریت سے خالی نظر آتے ہیں۔ آمد کے اشعار کم اور آورد کے اشعار زیادہ ملتے ہیں۔ دوسرا دور 1821ء تا 1827ء ہے جس میں انھوں نے اردو شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کا استعمال کم کر دیا۔ نیز بیدل کے بجائے نظیری کا تتبع کیا۔ شاعری میں عاشقانہ رنگ غالب آ گیا اور فطرت انسانی کی عکاسی خوب کی۔ خیالی مضامین سے دامن بچایا اور زندگی

کے تلخ حقائق کو اپنے شعروں میں خوب برتا۔ تیسرا دور 1827ء تا 1847ء ہے جس میں انھوں نے زیادہ توجہ تو فارسی شاعری پر کی لیکن اردو شاعری کو بھی جلا بخشتے رہے۔ ان کی بہت سی نمائندہ غزلیں اسی دور کی ملتی ہیں۔ چوتھا دور 1847ء تا 1857ء ہے جس میں غالب نے اردو شاعری پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ اس دور میں جی کھول کر تواتر کے ساتھ غزلیں کہیں۔ انداز بیان پختہ ہو گیا۔ طنز، شوخی اور ظرافت کا رنگ نمایاں ہوا۔ لطفِ زبان ہر جگہ نظر آنے لگا۔ یہی وہ دور ہے جس میں انھوں نے جذبہ میں تخیل کو اس طرح سمو دیا کہ ان کی انفرادیت قائم ہو گئی اور وہ غالب بن گئے۔ آخری دور 1857ء تا 1868ء ہے جس میں غالب نے عام فہم، سادہ اور سلیس شاعری کو خوب فروغ دیا۔ اس دور میں ان کا کلام سادہ اور سلیس نظر آتا ہے۔ بندش کی چستی اور شوخی و ظرافت کی پختگی نمایاں ہو جاتی ہے اور کوئی بھی غزل مخصوص طرز ادا، حسن بیان اور لطف زبان سے خالی نظر نہیں آتی۔

اب آیئے غالب کی شاعرانہ خصوصیات پر نظر ڈالیں جن سے ان کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ یوں تو بہت سے ناقدین اور ماہرین فکر و فن نے غالب کی شاعری کی متعدد خوبیاں بیان کی ہیں لیکن ان میں مشکل پسندی، انفرادیت، ظرافت، رمزیہ انداز بیان، ایجاز و اختصار، تہہ داری، دل نشینی، حقائق نگاری، انانیت، فلسفہ، حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کا استعمال، استفہامیہ انداز بیان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(الف) مشکل گوئی: ہر دور میں غالب کی مشکل گوئی پر بحث ہوتی رہی ہے لیکن آل احمد سرور کی اس بات پر غور کیا جائے کہ ''زندگی سادگی سے پیچیدگی کی طرف رخ کرتی ہے'' تو غالب کے کلام میں دشوار پسندی سے بھی بہت کچھ معنی نکالے جا سکتے ہیں۔ دراصل دشوار پسندی سے شاعری فوراً سمجھ میں نہیں آتی بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے گہرے مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ غالب کی ابتدائی شاعری مشکل اور نا قابل فہم ہے جسے مہمل تک کہا گیا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ غالب نے اپنی غزلوں میں معمولی مضامین کو بھی پیچیدہ بنا کر پیش کیا۔ معمولی اور آسان مضمون کو بھی انھوں نے استعاروں اور کنایوں سے اس طرح بیان کیا کہ اس کی مختلف صورتیں پیدا ہو گئیں۔ ان کے یہاں لفظوں کے طلسم سے بھی مشکل پسندی آ گئی ہے۔ خود غالب کو بھی اپنی دشوار پسندی کا بخوبی احساس تھا۔ چند

اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے　　خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

یک اِلف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز　　چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ　　بہ رنگِ خار مرے آئنے سے جوہر کھینچ

(ب) انفرادیت: غالب کی غزل گوئی کا اصل جوہر انفرادیت ہے، ان کا انداز بیان بہت مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی شعری روایات کو من وعن قبول نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اپنی پسند و ناپسند کا خیال رکھا۔ جو چیزیں انھیں پسند تھیں ان کو قبول کیا اور جو ناپسند تھیں انھیں یکسر نظر انداز کر دیا اور اپنا الگ راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے حیات و کائنات کے اسرار و رموز کو اپنے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ غالب کے شاگرد خاص الطاف حسین حالی نے بھی اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ انھوں نے عام روش پر چلنے سے ہمیشہ گریز کیا، ان کی شاعرانہ عظمت کی عمارت جدت طرازی پر ہی تعمیر ہوتی ہے جسے کسی نے مخصوص طرز ادا، کسی نے ادائے خاص تو کسی نے جدت بیان، طرفگی ادا وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ شاعری کے تمام لوازمات مثلاً تشبیہات، استعارات، کنایات، تراکیب، زبان و بیان، مکالمات وغیرہ کو غالب نے بڑے سلیقے سے شاعری میں برتا ہے۔ انھوں نے معمولی خیال کو بھی اپنی جدت طرازی کی بدولت پر لطف بنا دیا ہے۔ ان کا اچھوتا پن محسوس کیجیے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا　　صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نئے الفاظ، نئی ترکیبیں، نئی بندشیں، نئی نئی تشبیہات، نئے نئے استعارات و کنایات کو بھی انھوں نے وضع کیا جس سے ان کی شاعری تہہ دار ہو گئی۔ الفاظ سازی کے فن میں بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ اس انفرادیت اور جدت

طرازی کے شوق نے انھیں باکمال شاعر بنا دیا۔

(ج) ظرافت: غالب کی شاعری کا ایک وصف خاص ظرافت بھی ہے۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی تبھی انھیں 'حیوان ناطق' کے بجائے 'حیوانِ ظریف' کہا گیا۔ وہ چونکہ ایک بزلہ سنج انسان تھے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کو بڑی ذہانت و فطانت سے پیش کیا۔ ان کی ظرافت میں جو پاکیزگی ہے وہ سب کو متاثر کرتی ہے۔ سودا اور انشا کی طرح غالب اپنی ظرافت، ہجو گوئی میں صرف نہیں کرتے بلکہ سادگی، سنجیدگی اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ظرافت، مزاح، طنز اور شوخی کی الگ الگ نشاندہی کی جاسکتی ہے جس سے شاعر کی ذہانت، پرواز تخیل اور رسائی ذہن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے:

ظرافت دیکھیے:

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مزاح ملاحظہ فرمایئے:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

شوخی کی مثال دیکھیے:

وہ آئے گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب نہ صرف دوسروں پر ہنستے ہیں بلکہ خود اپنا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایسی بہت سی

مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جن سے اس کی تصویر کشی ہوتی ہے۔صرف ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

چاہتے ہیں خُوبرُویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(د) رمزیہ انداز بیان: غالب کی شاعری کی ایک خصوصیت رمزیہ انداز بیان بھی ہے۔غور سے دیکھا جائے تو غالب کی غزل گوئی کا ایک کمال ان کے رمزیہ انداز بیان میں چھپا ہوا ہے، جس کا اعتراف ہمارے بہت سے صف اول کے ناقدین نے کیا ہے۔ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے قدآور ناقدوں نے غالب کی شاعری میں رمزیت اور ایمائیت کی نشاندہی کی ہے۔اگر غزل رمزیت اور ایمائیت سے خالی ہو تو معنوی تہہ داری اور فکری بلندی کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔غالب کو اس بات کا احساس تھا اسی لیے انھوں نے اپنے کلام میں رمز و کنایہ سے خوب کام لیا۔ان کے اس وصف سے ان کی شاعری میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔رمز و ایما کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

(ہ) ایجاز و اختصار: غالب دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔ان کی شاعری میں ایجاز و اختصار کی خوبیاں ہر جگہ نظر آتی ہیں۔وہ دوسروں کی طرح اشعار میں طول کلامی سے پرہیز کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بہت کم الفاظ میں معنی کی ایک دنیا آباد ہے۔غالب کو اس بات کا احساس تھا تبھی وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالب اپنے اشعار میں بہت ہنرمندی سے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے ایجاز واختصار کی خوبی پیدا ہوجاتی ہے۔

چنداشعار:

کیوں کر اُس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

(و) تہہ داری: غالب کی غزل گوئی کی ایک نمایاں خصوصیت تہہ داری ہے۔ یہ بھی غالب کا کرشمہ ہے کہ ان کے ایک ہی شعر میں معنی کی کئی تہیں مل جاتی ہیں۔ ان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں بظاہر تو ایک معنی نظر آتا ہے لیکن جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو دوسرے دلچسپ اور لطیف معنی بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان کا ایک مقبول شعر ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر کا ایک معنی یہ ہوا کہ دشت کی ویرانی دیکھ کر شاعر کو اپنا گھر یاد آیا کہ اس کا گھر بھی ایسا ہی ویران تھا۔ دوسرا معنی یہ ہوا کہ عشق کی وجہ سے شاعر کو دشت کی خاک چھاننا پڑی یعنی عشق نے دشت پیمائی کرائی اور اسے یہ ویرانی دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ آخر اس نے عشق کیا ہی کیوں، نہ وہ عشق کرتا اور نہ اسے گھر چھوڑ کر ویرانے میں آنا پڑتا جبکہ اس کا تیسرا معنی استفہامیہ انداز بیان سے واضح ہوتا ہے۔ یعنی دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے۔ اس سے زیادہ ویرانی تو اس کے گھر میں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر ویرانی ہی دیکھنی ہو تو اس کے گھر کی ویرانی کو دیکھو۔ غالب کے دیوان میں ایسے بے شمار اشعار موجود ہیں جن سے ایسی تہہ داری ظاہر ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

(ز) دل نشینی: جذبہ اور تخیل کی آمیزش سے غالب کے کلام میں غیر معمولی دلکشی اور دل نشینی پیدا ہوجاتی ہے۔ حکیمانہ تفکر اور شاعرانہ تخیل کی خوبیاں ایک ساتھ یکجا کر کے اشعار میں گہرائی اور معنویت پیدا کرنے کا ہنر غالب کو خوب آتا

ہے۔ تفکر میں تغزل کے فقدان سے اور تخیل میں شعریت کی کمی سے اشعار میں دل نشینی اور دل کشی کا لطف آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن غالب ان خوبیوں سے خوب واقف ہیں۔ چند اشعار:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا

(ح) حقائق نگاری: غالب کی شاعری کی ایک خصوصیت حقائق نگاری بھی ہے۔ شاعر کو انسانی فطرت کا گہرا مشاہدہ ہے۔ اس لیے اس نے انسان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات وحادثات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر شخص کو غالب کے کلام میں اپنی آپ بیتی نظر آتی ہے۔ حقائق نگاری کی اس خوبی کے سبب ہی کلام غالب کو بہت زیادہ حوالے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تحریر اور تقریر میں غالب کے جتنے اشعار حوالوں میں استعمال کیے جاتے ہیں اتنا شاید ہی کسی اور شاعر کے اشعار۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کے اشعار سے لوگوں کو اپنے جذبات وخیالات کے اظہار میں زیادہ مدد ملتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(ط) انانیت: ہمارے بہت سے نقادوں نے غالب کو انا کا محافظ بھی کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں انا کا پہلو غالب ہے۔ بہت سے فنکار ایسے ہوتے ہیں جو حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور انھیں زندگی جس شکل میں بھی ملتی ہے وہ اسی طرح اسے گوارا کر لیتے ہیں لیکن غالب کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے ہزار مشکلوں کے باوجود خود کو برتر ہی محسوس کیا۔ حالات سے آنکھیں ملائیں اور دنیا کو اپنے طور پر محسوس کیا اور اسے شعری قالب میں ڈھالا۔ ان کے بہت سے اشعار میں خودستائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالب کو نثر ونظم دونوں میں کمال حاصل تھا شاید اسی

لیے انھوں نے کسی کو اپنا ہم سر نہیں سمجھا۔ چند مثالیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیے ہے زباں میری تیغِ جوہر دار

(ی) فلسفہ: غالب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں فلسفیانہ مسائل کا اظہار کیا۔ وہ فلسفی تو نہیں تھے لیکن ان کا مزاج فلسفیانہ ضرور تھا۔ اسی لیے وہ اپنی شاعری میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ سوال کرتے ہیں اور ان کا یہ عمل ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غالب نے تفکر کو تغزل کے سانچے میں ڈھال کر اردو غزل کو جو نئی راہ دکھائی وہ ان کے فلسفیانہ مزاج کی بدولت ہی ممکن ہو سکا۔ اس اعتبار سے غالب کو فلسفی شاعر بھی کہنا غلط نہ ہوگا۔ چند اشعار بطور مثال:

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

(ک) حسن و عشق: غالب کی غزل گوئی کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کی مختلف کیفیات اور پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے عاشق کے جذبات و خیالات اور معشوق کی حالت کو بہت گہرائی سے محسوس کیا اور اسے نظم کیا۔ حسن و عشق کی جتنی بھی کیفیات ہو سکتی ہیں وہ سب غالب کے یہاں نظر آتی ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ غالب کی شاعری عشق و محبت کی کیفیات کا ایک نگار خانہ ہے جو ہم سب کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ مثلاً چند اشعار:

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجیے، ہم نے مدعا پایا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(ل) استفہامیہ انداز بیان: غالب کے کلام میں استفہامیہ انداز بیان بھی خوب ملتا ہے۔ اس نوع کے انداز بیان

سے ان کی غزلوں میں دلکشی اور رعنائی نیز موضوعات میں رنگارنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ اشعار میں سوالیہ طرز ادا کو بڑی خوبصورتی سے غالب نے پیش کیا ہے جس سے تہہ داری واضح ہوتی ہے۔ ایک دو شعر دیکھیے :

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے　　تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

مذکورہ شاعرانہ خصوصیات کے علاوہ بھی کلام غالب میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ سہل ممتنع، تجنیس، روزمرہ، لطفِ زبان، حسن تقابل، استدلالی انداز بیان، سوز و گداز وغیرہ کی مثالیں بھی غالب کے یہاں بھری پڑی ہیں۔ غالب کو آئینہ، جوہر آئینہ، رنگ، موج سیلاب، وجود، ہستی، برق، وجود جیسے الفاظ بہت پسند تھے اس لیے انھوں نے اس قسم کے اپنے محبوب الفاظ کو اپنی شاعری میں بار بار استعمال کیا ہے۔

غالب کی شاعری کے حوالے سے سب سے بڑی بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ مشکل پسندی اور سہل ممتنع کے درمیان جو لکیر ہے وہی اصل لکیر ہے جس سے غالب کی شناخت قائم ہوتی ہے۔ حسن و عشق، واردات، محاکات کی شاعری ہو یا فلسفیانہ مسائل، انانیت، ظرافت، حقائق نگاری یا رمزیہ شاعری ہو ہر جگہ غالب اپنی فکری بالیدگی اور فنی پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قافیہ اور ردیف کے دائرے میں رہ کر بھی انھوں نے کوئی جبر قبول کرنا پسند نہیں فرمایا۔ گویا یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو غزل کی تمام خصوصیات غالب کی شاعری میں موجود ہیں اور غالب کی بدولت ہی اردو شاعری معراج کو پہنچتی ہے نیز غالب جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4۔ غالب کی معرکہ آرائی کس شاعر کے ساتھ مشہور ہے؟

5۔ غالب کن ماہرین فن سے اپنے کلام پر مشورے لیتے تھے؟

6۔ غالب نے کن اردو اور فارسی شعراء کی تقلید کی؟

6.5 مرزا غالب کی غزل (1)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وِصالِ یار ہوتا　　اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جُھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو　　یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح　　کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ　　تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

6.5.1 مجموعی تاثر

یہ غزل غالب کی مقبول ترین غزلوں میں سے ایک ہے جو ان کی شعری بصیرت کو پوری طرح عیاں کرتی ہے۔ اس غزل سے غالب کا منفرد انداز بیان بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی اس غزل میں انداز بیان کی جو ندرت، جو معنی آفرینی، جو جدت اور انوکھا پن ہے وہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ غالب نے اپنی اس غزل میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان کی حیثیت گنجینۂ معنی کے طلسم سے کچھ کم نہیں۔ غزل میں وصل یار کا انتظار کرنے اور معشوق کو عہد شکنی کے الزام سے بچا کر دل کو تسلی دینے کی بات اپنی معنی خیزی کو واضح کرتی ہے۔ معشوق کی تیر نیم کش کی تعریف بھی بہت عمدہ انداز میں کی گئی ہے اور درد عشق کا علاج وصل محبوب بتا کر شاعر نے دوست ناصح کا فرض نبھایا ہے۔ زندگی میں عشق کی بدولت رسوائی اور مرنے کے بعد بھی جگ ہنسائی کا سبب عشق ہے، اس خیال کو غالب نے بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ تصوف کے دقیق مسائل کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ غزل عشق، رسوائی، تیر نیم کش کی تعریف، انتظار کا لطف یا معشوق کے وعدۂ وصل اور مسائل تصوف سے عبارت ہے۔ غزل کے یہ وہ موضوعات ہیں جنھیں غالب نے بڑی سنجیدگی اور تفکر آمیز لہجہ میں بیان کر دیا ہے۔ جو خاص انہی کا حصہ ہے۔ ان کے شعری اظہار کا رویہ اس ایک غزل سے بھی واضح ہو جاتا ہے اور یہی اس غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

6.5.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: ہماری قسمت میں وصال یار سے لطف اندوز ہونا نہیں تھا۔ اس لیے اگر فراق کی حالت میں ہی موت ہوگئی تو اچھا ہوا، کیونکہ اگر اور زندہ رہتے تو یار کے انتظار کے کرب سے ہی گزرنا پڑتا۔ یعنی اچھا ہی ہوا کہ ہم مر گئے اور وصالِ یار کے انتظار کی تکلیف سے نجات پا گئے۔ اس شعر کا بنیادی تصور محرومیٔ قسمت کی شکایت ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم اپنے محبوب کے وعدۂ وصل کے بعد بھی زندہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں محبوب کے وعدہ پر اعتبار نہیں رہا کیونکہ وعدۂ وصل پر اگر اعتبار ہوتا تو خوشی سے مر جانا یقینی تھا۔ یعنی وعدۂ وصل کے باوجود اگر عاشق زندہ ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اسے اعتبار وعدہ نہیں رہا ورنہ وہ محبوب سے ملنے کی خوشی میں کب کا مر گیا ہوتا۔ اس شعر کا بنیادی تصور اعتبار وعدہ کا فقدان ہے۔

تیسرا شعر: تیر نیم کش اس تیر کو کہتے ہیں جو آدھی کمان کھینچ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس تیر سے مراد تیر مژگاں ہے۔ یعنی معشوق کی نیچی نظر جو انتہائی دلکش ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تیرے تیر نیم کش نے میرے جگر کو مارا ہے۔ یعنی اس کی کیفیت میرا دل ہی جانتا ہے اور اس سے جو مجھے لطف حاصل ہوا وہ میں ہی جانتا ہوں، اس لیے اگر تو اسے پورے زور سے چھوڑتا تو وہ جگر کے پار ہو جاتا اور میں لذت خلش سے محروم رہ جاتا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ معشوق نیم وا چشم سے شرماتا ہے اور شاعر اس کی تعریف کر کے اس کی شرمندگی دور کر رہا ہے۔ اس شعر کا بنیادی تصور تیر نیم کش سے حاصل ہونے والی لذتِ خلش ہے۔

چوتھا شعر: شاعر کہتا ہے کہ عشق میں دوست چارہ سازی اور غمگساری کی بجائے نصیحت آمیز باتیں کرتے ہیں تو دل دکھتا ہے۔ دوستی کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ وہ ترک محبت کا مشورہ دیں اور دکھ کا کوئی مداوا نہ کریں۔ دوست وہ ہوتے ہیں جو وصال یار کی تدبیریں نکالتے ہیں نہ کہ نصیحت پر نصیحت کرتے ہیں۔ یہ دوستی نہیں دشمنی ہے۔ دردِ عشق کا علاج وصلِ یار ہے۔ اس لیے دوستوں کو دکھ کا علاج کرنا چاہیے تھا۔ اس شعر کا بنیادی تصور احباب سے نصیحت کرتے رہنے کا شکوہ ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں تو عشق کی وجہ سے میں بدنام تھا ہی، مرنے کے بعد بھی ہماری خوب رسوائی ہوئی کیونکہ ہمارا جنازہ بھی اٹھایا گیا اور مزار بھی بنایا گیا اور ہماری رسوائی کے سامان میں بھی کوئی کمی نہیں کی گئی۔ اگر ہم دریا میں غرق ہو جاتے تو ہماری موت کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ نہ ہمارا جنازہ اٹھتا اور نہ ہی کہیں پر مزار ہی بنتا۔ شعر کا بنیادی تصور گمنامی کی زندگی بسر کرنا ہے۔

چھٹا شعر: اے غالب تو نے تصوف کے مسائل کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ہمارے ذہن و دل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر تو بادہ خوار نہ ہوتا تو لوگ تجھے ولی سمجھ بیٹھتے۔ اس شعر میں شاعر نے اپنی شاعری کی دو خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ پہلی خصوصیت مسائل تصوف اور دوسری خصوصیت 'انداز بیان' ہے۔ یعنی غالب کی شاعری کو تصوف کے دقیق مسائل اور مخصوص انداز بیان سے صرف نظر کر کے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. غزل (1) کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
8. تیر نیم کش کس تیر کو کہتے ہیں؟

6.6 مرزا غالب کی غزل (2)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت، کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب! ہمیں نہ چھیڑ، کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

6.6.1 مجموعی تاثر

غالب کی یہ غزل بھی بے حد مقبول ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی اور انکساری کے ساتھ دل کی آرزو کو بیان کر دیا ہے۔ اس غزل کے رنگ و آہنگ سے غالب کی شناخت ہوتی ہے۔ ان کا لہجہ اس غزل سے پوری طرح عیاں ہوتا ہے۔ اس غزل میں تشبیہ اور استعارے کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جوشِ قدح کو چراغاں سے تشبیہ دے کر شاعر نے مطلع کو تہہ دار بنا دیا ہے۔ نیز غزل میں عشق کرنے کی آرزو، محبوب کے ساتھ شراب پینے کی یاد اور اس کے در پر پڑے رہنے کی خواہش، محبوب کے تصور میں ہمیشہ کھوئے رہنے اور رو رو کر طوفان برپا کرنے کی بات ٹھان لینے کے خیال کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کی یہ خواہش بھی کہ اس کا محبوب اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا کر اس کے سامنے بیٹھے تا کہ اسے لذت ملے، بہت دلفریب خواہش ہے۔ مرزا غالب نے عشق کی مختلف کیفیات کو شعری جامہ پہنا کر بڑی شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ غالب کی شاعرانہ خصوصیات میں تہہ داری، رمز و کنایے، تشبیہ و استعارے کا استعمال، ایجاز و اختصار، ظرافت، دل نشینی، حقائق نگاری، جدت طرازی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور کم و بیش یہ تمام خصوصیات مذکورہ غزل میں موجود ہیں۔ عشق و محبت کے مختلف پہلوؤں کو مخصوص انداز بیان سے پیش کرنے کا جو ہنر غالب کو آتا تھا وہ بعد کے شعراء میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اس غزل میں بھی عشق و محبت کے بہت سے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ لفظیات عام فہم ہیں جس سے غزل کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

6.6.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: شاعر نے اس شعر میں اپنی محبت کی یاد تازہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ محبوب کو گھر بلائے ہوئے مدت گزر گئی۔ جب وہ کبھی گھر آیا تھا تو اس کی آمد سے در و دیوار روشن ہو گئے تھے۔ ہم نے اس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پی تھی، اور اب زمانہ گزر گیا وہ مہمان نہیں آیا اور اس کے نہ آنے کے سبب ہی ہم نے ساغروں سے بزم کو روشن نہیں کیا۔ مطلب یہ کہ یار آئے تو پھر بزم کو جوش قدح سے چراغاں کروں، شاعر نے جوش قدح کو چراغاں سے تشبیہ دی ہے اور یہی اس شعر کی خوبی بھی ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر معشوق کا طلب گار ہے۔ شاعر نے اپنی عقل و دل و جان کی دولت کو پھر سے سجایا ہے تا کہ کوئی خریدار (معشوق) آئے اور ان چیزوں کو خرید کر اپنے ساتھ لے جائے۔ یعنی عشق کو پھر کسی خریدار کی ضرورت ہے۔ مطلب یہ کہ غالب پھر کسی معشوق کو اپنا دل دینا چاہتے ہیں۔ اس شعر کا بنیادی تصور آرزوئے عشق ہے۔

تیسرا شعر: شاعر اس بات کا خواہش مند ہے کہ اس کا معشوق اس کے سامنے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگا کر بیٹھے تا کہ اس کی پلکوں سے اس کا دل زخمی ہو جائے۔ یعنی شاعر سرمگیں چشمِ معشوق سے اپنے دل کو زخمی ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ شاعر کی آرزو بہت دلکش ہے جس سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چوتھا شعر: شاعر کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے معشوق کے دروازے پر برسوں پڑا رہے اور دربان کے احسان سے اس کا سر جھکا رہے۔ دربان کا احسان یہ ہو کہ وہ معشوق کے دروازے پر پڑے رہنے کی اجازت دے دے۔ مطلب یہ کہ جب دربان اجازت دے گا تو شاعر کو معشوق کے دروازے سے کوئی نہیں اٹھائے گا۔ ظاہر ہے اس کے لیے وہ دربان کا احسان مند ہوگا اور اس کے دل کو راحت ملے گی۔ اس شعر میں معشوق کے دروازے پر پڑے رہنے کی آرزو بہت دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ کاش ایسی فرصت مل جائے کہ رات دن وہ تصور جاناں ہی میں غرق رہے۔ اس سے قبل شاعر کو کبھی ایسی فرصت ملی تھی جب وہ رات دن معشوق کے زلف و رخ کے تصور میں رہتا تھا۔ ایک بار پھر وہ اسی فرصت کا متمنی ہے۔ تصور جاناں میں غرق رہنے کی آرزو ایک عجیب کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

چھٹا شعر: غالب کو مت چھیڑ ورنہ طوفان اشک برپا ہو جائے گا۔ شاعر نے پہلے ہی سے جوشِ اشک سے طوفان برپا کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے، اس لیے وہ کہتا ہے کہ اسے مت چھیڑ کیونکہ وہ رونے پر تلا ہوا ہے اور اگر رویا تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ یعنی رو رو کر طوفان برپا کرنے کے ارادہ کو غالب نے نہایت معصومانہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے شاعر سب کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

9. غالب نے اس غزل کے مطلع کو کس طرح تہہ دار بنایا ہے؟

10. پانچویں شعر میں شاعر کس خواہش کا اظہار کرتا ہے؟

6.7 خلاصہ

مرزا غالب 27 دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ پانچ برس کے ہی تھے کہ ان کے والد ایک جنگ میں مارے گئے۔ پھر ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی۔ انھیں انگریز حکومت سے وظیفہ بھی ملا۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالب اعتدال پسند تھے۔ وہ زندگی بھر مالی مشکلات میں گھرے رہے۔ اپنی مالی حالت بہتر بنانے کے مقصد سے انھوں نے دور دراز کا سفر بھی کیا۔ غدر میں دہلی میں تباہی مچی تو ان کا مال واسباب بھی لٹ گیا۔ دلی کی تباہی کا غم انھیں زندگی بھر رہا۔ 15 فروری 1869ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔ فارسی اور اردو میں ان کی بیش بہا کتابیں موجود ہیں۔ ان کی زندگی میں صرف اردو دیوان ہی چھ بار چھپا اور ان کے انتقال کے بعد اردو دیوان کے کئی قابل تحسین ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

اس اکائی میں مرزا غالب کی غزلیہ شاعری کی متعدد اہم خصوصیات پر بھی گفتگو کی گئی جن میں مشکل گوئی، انفرادیت، ظرافت، رمزیہ انداز بیان، ایجاز واختصار، تہہ داری، دل نشینی، حقائق نگاری، انانیت، فلسفہ حسن وعشق، استفہامیہ انداز بیان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غالب کی شاعری کے مختلف ادوار کا ذکر بھی اس اکائی میں کیا گیا۔ ان کی نثری اور شعری تصنیفات سے متعلق مزید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس اکائی میں غالب کے شعری امتیازات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ غالب کے محبوب الفاظ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے تاکہ ان کی انفرادیت واضح ہو سکے۔ غالب نے نئے الفاظ، نئی ترکیبیں، نئی بندشیں، نئی نئی تشبیہات واستعارات اور کنایات کو وضع کر کے اردو غزل کو ایک نیا جہانِ معنی عطا کیا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اکائی میں غالب کی مختصر سوانح حیات، ان کی مالی مشکلات، نثری وشعری تصنیفات کا ذکر اور ان کی شاعری کے مختلف ادوار کے ساتھ شاعرانہ خصوصیات کا مطالعہ کیا گیا۔ اکائی میں غالب کی دو مقبول

غزلیں بطور نمونہ پیش کی گئیں اور اُن غزلوں کے اشعار کی تشریحات بھی پیش کی گئیں نیز اُن کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا۔ پہلی غزل غالب کی مقبول ترین غزلوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس غزل سے غالب کا منفرد انداز بیان بھی نمایاں ہوتا ہے۔ انداز بیان کی ندرت اور معنی آفرین اس غزل کی اہم خصوصیت ہے۔ دوسری غزل بھی بے حد مقبول غزل ہے۔ اس غزل کا رنگ و آہنگ غالب کی شناخت کا سبب ہے۔ تشبیہ و استعارے کا جس قدر خوبصورت استعمال اس غزل میں ہوا ہے۔ وہ کہیں اور بہت کم نظر آتا ہے۔

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1۔ مرزا غالب کی ولادت، خاندان اور تعلیم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ مرزا غالب کی مالی دشواریوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

3۔ مرزا غالب کی نثری اور شعری تصنیفات سے متعلق آپ اپنی معلومات سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1۔ غالب کی سوانح حیات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ غالب کی کسی ایک غزل کے پانچ اشعار لکھ کر اُن کی تشریح کیجیے۔

3۔ غالب کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

6.9 فرہنگ

متمول	دولت مند، مالدار	مے نوش	شرابی، بادہ خوار
اثنا عشری	شیعہ، امامیہ	قمار بازی	جُوا کھیلنا، جُوا
قولنج	وہ درد جو پسلی کے نیچے ہوتا ہے	قنوطیت	ناامیدی، یاسیت

طلسم	جادو، منتر، ٹونا	تتبع	تقلید، پیروی
نخشب	کنویں سے نکالا گیا چاند	صیقل	آب، چمک
ساغرِ جم	جمشید کا پیالہ	جامِ سفال	مٹی کا پیالہ
فسون	جادو، ٹونا، منتر	گنجینۂ معنی	معنی کا خزینہ
استفہام	سوال کی علامت، دریافت کرنا	نشاط	خوشی، شادمانی
حیوانِ ظریف	بزلہ سنج، خوش طبع	حیوانِ ناطق	آدمی، انسان
خودستائی	اپنی تعریف آپ	بازیچۂ اطفال	بچوں کا کھیل تماشہ
رزم	لڑائی، جنگ	غمزہ	اشارہ، ناز، نخرہ
عشوہ	ناز فریب، ادائے معشوقانہ، کرشمہ	سبزہ وگل	شادابی
زود پشیماں	جلد شرمندہ ہونا، جلد پچھتانے والا	مدعا	مقصد، غرض
نیم واچشم	ادھ کھلی آنکھ	جوشِ قدح	شراب کا پیالہ
چراغاں	روشنی، دیپ مالا	دشنہ	خنجر، کٹاری
مژگاں	مژہ کی جمع، پلکیں	تیر نیم کش	کمان آدھی کھینچ کر چھوڑا ہوا تیر
خلش	چبھن	چارہ ساز	علاج کرنے والا

6.10 معاون کتابیں

1. اسداللہ خاں غالب — دیوان غالب
2. الطاف حسین حالی — یادگار غالب
3. مالک رام — ذکر غالب
4. یوسف سلیم چشتی — شرح دیوان غالب

6.11 اپنے مطالعہ کی جانچ: جوابات

1: مرزا غالب 27/دسمبر 1797ء کو آگرے میں پیدا ہوئے اور 15 فروری 1869ء کو دہلی میں ان کی وفات ہوئی۔

2: غالب کا اردو دیوان اُن کی زندگی میں چھ بار چھپا۔

3: غالب کی وفات کے بعد ان کے اردو دیوان کے کئی ایڈیشن چھپے جن میں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی، گُلِ رعنا، مرقعِ چغتائی، نقشِ چغتائی، دیوانِ مصور از صادقین اور نسخۂ عرشی زادہ قابل ذکر ہیں۔

4: ذوق کے ساتھ۔

5: مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے مشورے لیتے تھے۔

6: غالب نے اردو میں ناسخ کی اور فارسی میں بیدل، ظہوری، عرفی، نظیری وغیرہ کی تقلید کی۔

7: انداز بیان کی ندرت، شعری بصیرت، معنی آفرینی وغیرہ اہم خصوصیات ہیں۔

8: وہ تیر جو آدھی کمان کھینچ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

9: غالب نے جوشِ قدم کو چراغاں سے تشبیہ دے کر اس مطلع کو تہہ دار بنا دیا ہے۔

10: پانچویں شعر میں شاعر فرصت کے ایسے اوقات کی تمنا کرتا ہے جب وہ رات دن تصور جاناں میں ہی ڈوبا رہے۔

بلاک نمبر-3

نظم

اکائی ۷۔ساحرؔ لدھیانوی۔'خون پھر خون ہے'

اکائی ۸۔مخدومؔ محی الدین۔'چارہ گر'

اکائی ۹۔کیفیؔ اعظمی۔'مکان'

درج بالا بلاک 'نظم' کے عنوان سے ہے اور تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔اس بلاک میں ترقی پسند شعرا ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین اور کیفیؔ اعظمی اور ان کی ایک ایک نمائندہ نظم بالترتیب 'خون پھر خون ہے'، 'چارہ گر' اور 'مکان' کو شامل کیا گیا ہے۔ بلاک کی پہلی اکائی میں آپ ساحرؔ لدھیانوی کی حیات اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ان کی نظم 'خون پھر خون ہے' کی تشریح اور خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔دوسری اکائی کے مطالعے سے آپ اردو کے معروف شاعر مخدوم محی الدین کی شخصیت' ان کی نظم نگاری اور شامل نصاب ان کی نظم 'چارہ گر' سے واقفیت حاصل کریں گے۔تیسری اکائی کیفیؔ اعظمی کی شاعرانہ عظمت سے متعلق ہے۔اس میں آپ کیفیؔ اعظمی کی نظم 'مکان' کے مقصد و مطلب اور خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے مختصر حالات زندگی اور ان کی شاعری کے مختلف ادوار واس کی خصوصیات سے بھی واقف ہو جائیں گے۔

اکائی 7 : ساحرلدھیانوی۔ ''خون پھرخون ہے''

ساخت

16.1 اغراض ومقاصد

16.2 تمہید

16.3 ساحرلدھیانوی کی حیات

16.4 ساحرکی شاعرانہ خصوصیات

16.4.1 ساحرکی رومانی شاعری

16.4.2 1 ساحرکی احتجاجی شاعری

16.4.3 ساحرکی شاعری میں عورت کا مقام

16.4.4 ساحرکی سیاسی وانقلابی شاعری

16.5 نظم ''خون پھرخون ہے'' کا متن

16.6 تشریح

16.7 خلاصہ

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

16.9 فرہنگ

16.10 معاون کتابیں

16.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

16.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ ساحرلدھیانوی کی حیات' اُن کی شاعرانہ خصوصیات اوراُن کی نظم ''خون پھرخون ہے'' کے مطلب ومقصداورخصوصیات کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔اس نظم کا مقصد ہے کہ کوئی بھی ظلم زیادہ

دنوں تک قائم نہیں رہتا قتل کتنا ہی چھپا کر کیا جائے اس کا سراغ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا ہے۔ کیونکہ خون خود آواز دیتا ہے اور انسانوں کا ہاتھ' مظلوموں کا ہاتھ قاتل کے' مجرم کے گریبان تک پہنچ جاتا ہے۔ ساحر نے یہ نظم لومبا کی یاد میں کہی تھی جس کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال تھا کہ ''ایک مقتول لومبا ایک زندہ لومبا سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔'' ساحر نے پنڈت نہرو کے اس خیال کو اپنی نظم کے عنوان کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ اس خیال سے بھی شاعر کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

16.2 تمہید

نظم ''خون پھر خون ہے'' ساحر کی سیاسی و انقلابی نظم ہے جس میں شاعر کا مطلب ہے کہ ظلم آخر ظلم ہوتا ہے اور ظالم آخر ظالم..... ظالم جس کا کوئی مذہب' کوئی سماج و معاشرہ اور کوئی ملک نہیں ہوتا جبکہ مظلوم وہ ہے جس کا اپنا ملک ہوتا ہے' سماج و معاشرہ ہوتا ہے' گھر خاندان ہوتا ہے' جو ملک اور سماج کے قوانین' رسم و رواج کو ملحوظ رکھ کر جیتا ہے۔ خدمت خلق اور انسانی درد کی پاسداری اس کا خاص نصب العین ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہوتا ہے وہ انسانیت سے جیتا ہے اور انسانوں کے حق کے لیے آواز بھی اٹھاتا ہے' وہ زندگی پرسکون طریقہ سے گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ جبکہ ظالم فتنہ و فساد کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہے اور اسی میں جینے مرنے کا قائل ہوتا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب مظلوموں کی دبی ہوئی آواز نعرہ بن کر ابھرتی ہے' انقلاب آتا ہے اور جمہوریت سے ٹکراؤ میں ظلم و ستم کی شکست ہوتی ہے کیونکہ عوام کے محکم ارادوں کے سامنے ظلم کی کوئی اوقات نہیں رہ جاتی۔ اور ظلم کا ختم ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔

16.3 ساحر لدھیانوی کی حیات

ساحر لدھیانوی کی پیدائش 8 مارچ 1921ء کو لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام چودھری فضل محمد تھا۔ اور والدہ کا نام سردار بیگم۔ والد نے ساحر کا نام عبدالحئ رکھا۔ چونکہ کسی بات کو لے کر ان کے

والدین میں ناچاقی ہوگئی تھی اس لیے ساحر کی والدہ انہیں لے کر اپنے بھائیوں کے گھر چلی آئی تھیں۔ ساحر نے ابتدائی تعلیم مالوہ خالصہ اسکول میں حاصل کی۔ اسکول کے دنوں سے ہی لدھیانہ کے اہل ذوق کی صحبت کے زیر اثر شعر و شاعری کا شوق ہوگیا۔ لہٰذا 1937ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور نتیجہ نکلنے سے قبل جب قدرے فرصت تھی انہیں دنوں پہلا شعر کہا۔ انہیں دنوں انہیں اپنے شاعرانہ نام کی تلاش ہوئی۔ اقبال کی شاعری کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کی نظر اقبال کے ایسے شعر پر پڑی جس میں لفظ ''ساحر'' استعمال ہوا تھا۔ بس یہ نام پسند آیا اور وہ جلد ہی عبدالحئی سے ساحر ہوگئے۔ 1939ء میں ساحر نے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ یونین سوسائٹی کے صدر رہے اور اسٹوڈیٹ فیڈریشن سے بھی وابستہ رہے۔ انہیں سیاست سے کافی دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی نے ان کی سیاسی سرگرمیوں کو ابھارا اور بی۔ اے کے آخری سال میں انگریز حکام کی ناراضگی کے سبب ساحر کو کالج چھوڑنا پڑا۔ اس کالج کی فضا نے انہیں ایک خوبصورت رومانی و انقلابی شاعر بنا دیا۔ جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' 1944ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سرزمین سے ساحر کو جو تجربے ملے وہ ان کی شخصیت اور شاعری کا حصہ بنے۔ لدھیانہ کالج سے نکل کر ساحر نے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے سیاسی شعور، محنت، قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر انہیں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ ساحر نے فیڈریشن کے تئیں اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دی لیکن یہاں بھی ان کو سیاسی گرمجوشی کے سبب انگریز حکومت نے کالج چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ اگلے ہی برس اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے اپنی تعلیم برابر جاری رکھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہی ہاتھ آئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا سارا رجحان ادبی و سیاسی کاموں میں لگا دیا۔ ''تلخیاں'' کی اشاعت سے ساحر نوجوان شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری کی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا صحافتی سلسلہ شروع ہوا تو ساحر نے ادب لطیف، شاہکار، سویرا، شاہراہ کی ادارت کی۔ ساحر کے ذہن میں شروع سے ہی داخلی طور پر ترقی پسند نظریات کارفرما تھے۔ اس لیے وہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے وابستہ ہوگئے اور ان کا شمار اشتراکی و ترقی پسند شعرا میں ہونے لگا تھا۔ 1945ء میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں انہوں نے ''اردو کی انقلابی شاعری'' کے عنوان سے اپنا مضمون

پڑھا۔ حیدر آباد سے واپسی پر سجاد ظہیر، کرشن چندر، مجاز، کیفی اعظمی اور سردار جعفری وغیرہ انہیں ممبئی لے گئے۔ جہاں انہیں فلمی دنیا میں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا وہ ممبئی میں زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکے۔ 1947ء میں ملک کی تقسیم ہوئی اور ساحر اپنی والدہ کی تلاش میں لاہور پہنچے جو رفیوجی کیمپ میں پاکستان چلی گئی تھیں۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے دو ماہی رسالہ ''سویرا'' کی ادارت کی لیکن ناگزیر حالات کی تحت وہ پھر ہندوستان چلے آئے۔ 1948ء میں انہوں نے دہلی میں ماہنامہ ''شاہراہ'' کا اجرا کیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے ایک دوست کو اس رسالے کا ایڈیٹر بنا کر الگ ہو گئے اور رسالہ 'پریت لڑی' کی ادارت کرنے لگے مگر یہاں پر بھی زیادہ دنوں تک کام نہ کر سکے کیونکہ اب صحافت سے بھی ان کی دلچسپی کم ہو چکی تھی۔ 1949ء میں دوبارہ ممبئی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ کافی دنوں بے روزگار و پریشان رہے مگر خود اعتمادی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کی جدوجہد اور محنت کو دیکھتے ہوئے ایس۔ ڈی۔ برمن نے ان کی مدد کی تو ساحر نے فلمی دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔ ساحر نے فلم ''بازی'' کے لیے گیت لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔ فلمی گیتوں کو ادبی معیار دینے میں ساحر کا اہم رول رہا ہے۔ ان کے گیتوں کی مقبولیت اور فلمی نغموں کا معیار دیکھتے ہوئے انہیں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ 1955ء میں ان کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' منظر عام پر آئی۔ امن عالم کے موضوع پر لکھی گئی یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔ ساحر کا ادبی سفر رواں دواں رہا اور 1971ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' شائع ہوا۔ اس مجموعے نے بھی خوب شہرت حاصل کی جس میں ساحر نے عوام کے سوئے ہوئے جذبات و خیالات کو اپنی رومانی و انقلابی شاعری کے ذریعے جگایا۔ ساحر ان چند شعرا میں ہیں جنہوں نے فلمی نغمہ نگاری کو بھی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے روشناس کرایا اور ان کے چوتھے مجموعے ''گاتا جائے بنجارہ'' کی اشاعت ہوئی۔ ساحر کی ادبی و فنی صلاحیتوں کی بنا پر انہیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ 1975ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ ساحر کے لیے بڑا حادثہ تھا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور دل کی بیماری نے آخر کام تمام کیا۔ 25 اکتوبر 1980ء کو ساحر کا انتقال ہو گیا۔

ساحر لدھیانوی کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی ساری زندگی محرومیوں سے دوچار نظر آئے گی۔ جن سے

تمام عمر ان کی شخصیت متاثر ہوتی رہی۔ بچپن میں باپ کی شفقت سے محرومی، عشق کی ناکامیاں، پھر شریک حیات کی کمی غرض یہ کہ ساحر کی زندگی کا محاسبہ کیا جائے تو ایک کے بعد ایک محرومیاں کھڑی نظر آئیں گی۔ وہ ایک حساس طبیعت انسان تھے۔ انہیں انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے پیار تھا۔ وہ سماج و معاشرے سے ٹھکرائے لوگوں کا درد اپنے سینے میں محسوس کرتے اور یہی احساس ان کے اشعار کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ کیوں کہ یہی ان کی شاعری کا اصل مقصد تھا اور شاعری کا جوہر بھی تھا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. نظم ''خون پھر خون ہے'' ساحر نے کس کی یاد میں کہی؟
2. ساحر لدھیانوی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
3. ساحر کے مجموعے ''تلخیاں'' کا سن اشاعت لکھیے۔
4. ساحر نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟
5. ساحر کو گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے کیوں نکال دیا گیا؟
6. ساحر کے مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' کا سن اشاعت لکھیے۔

16.4 ساحر کی شاعرانہ خصوصیات

ساحر کی شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں ہم ان کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے باتیں کریں گے کیوں کہ وہ اصلاً نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں ان کی طالب علمی اور نوجوانی کے جوش و خروش کا نتیجہ ہیں جو ایک خاص عمر کی دین ہوتے ہیں جن میں ان کے معاشقوں کی جھلک ہے اور ملک و سماج کا درد بھی۔ ساحر کی زندگی کے حالات و حادثات نے ہمیشہ ان کا پیچھا کیا۔ جو ان کے اشعار میں ڈھل گئے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر کی شاعری میں عصری آ گہی، انسانی درد اور سیاسی و سماجی شعور سبھی عناصر موجود ہیں لیکن ان کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ساحر کی شاعری کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیں۔

16.4.1 ساحر کی رومانی شاعری

ساحر کے یہاں رومانیت کی نرم و نازک شیریں آواز ساحر کے مجموعہ تلخیاں کی مقبولیت کا سبب بن گئی۔ ساحر کے یہاں محبت کی کھلتی کلیاں ہیں جو پھول بنیں مگر ان پھولوں سے لدی شاخوں میں کانٹے بھی ہیں۔ جو اکثر مطالعہ کے دوران چبھتے رہتے ہیں۔ ساحر کی ایک نظم کا عنوان ''ردِعمل'' ہے جو ساحر کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر　　مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی　　تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

ساحر کے مجموعہ کلام تلخیاں کی ابتدا اسی نظم سے ہوتی ہے۔ ساحر کی رومانیت میں ان کے پاکیزہ جذبات و تصورات نے فکر کی معراج کو چھولیا ہے۔ ان کے یہاں خواب و خیال نہ صرف ذہنی و وقتی لطف کے لیے ہوتے ہیں بلکہ آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ کیونکہ زندگی میں اگر خواب نہ ہوں تو زندگی بے رنگ و بے مقصد ہو جائے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر خواب کی تعبیر پوری ہو لیکن فکر و خیال سے زندگی جینے کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور رومانیت میں خواب و خیال پر بڑا زور بھی دیا جاتا ہے۔ اس لیے ساحر کی رومانی نظمیں سماج کو نئے نئے خواب بننے کی دعوت دیتی ہیں۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکے

یہ بند ساحر کی نظم ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' سے ماخوذ ہے۔ یہ جاگتی آنکھوں کے خواب ہیں جو زمانے کو بدل دینے کے متمنی ہیں۔ ساحر اپنی قوم اور ملک کے لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش میں ہیں۔

16.4.2 ساحر کی احتجاجی (Protest) شاعری

ساحر کا احتجاج کہیں عشق کی ناہمواری کے لیے تھا کہیں سیاسی وسماجی بدعنوانی کے لیے۔ کہیں عورت کے حق کے لیے تو کہیں ملک کی آزادی کے لیے۔ ان کی احتجاجی نظمیں تہذیبی قدروں کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔ ساحر کے احتجاج کا سفر جوان کے اپنے خاندانی گھر یعنی زمین داروں کی بے جا حرکتوں سے شروع ہوا تھا وہ ملک وقوم کے رہنمؤں تک پہنچ گیا۔ جہاں انہوں نے شہنشاہوں کو بھی نہیں بخشا۔ نظم ''تاج محل'' میں ساحر نے شہنشاہ کے جذبات اور ''تاج محل'' کے حسن پر غور نہیں کیا بلکہ ان ہاتھوں کی فنکاری پر لوگوں کی توجہ دلائی جنہوں نے تاج محل کو سجایا' سنوارا تھا، حسن جاوداں بخشا تھا۔ مثال کے طور پر نظم کا بند ملاحظہ کیجیے:

تاج تیرے لئے اِک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی
میری محبوب انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک نہ ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

ساحر کی یہ نظم ان کے اشتراکی نظریہ کی دین ہے۔ سماج اور سیاست سے مخالفت کرتا ہوا ساحر کے احتجاج کا سفر جنگ وجدل کی طرف بڑھتا ہے۔ ساحر نے جنگ کو انسانیت اور تہذیب کا دشمن قرار دیا ہے۔ چونکہ جنگ سے جان

و مال کا نقصان ہوتا ہے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اپنی نظم ''اے شریف انسانو!'' میں ساحر جنگ کے خلاف اس طرح احتجاج کرتے ہیں۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے　　جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی　　بھوک اور احتیاج کل دے گی

ساحر نے جہاں عورت کی عظمت کے گیت گائے وہیں اس کے حق کے لیے احتجاج بھی کیا۔

16.4.3 ساحر کی شاعری میں عورت کا مقام

ساحر کی نظموں میں جہاں رومانیت اور احتجاج کی سرد و گرم کیفیت ہے وہیں عورت کی عظمت کا احترام بھی ہے۔ ساحر کی شاعری میں عورت حور یا پری نہیں بلکہ خالص ہندوستانی لڑکی ہے جو کہیں کسان کی جھونپڑی میں جنم لیتی ہے، کہیں جہیز کے لیے جلائی جاتی ہے تو کہیں مجبوریوں کے سبب طوائف بنا دی جاتی ہے۔ وہ کہیں زمانے کے ظلم کا شکار ہے، کہیں مفلسی کا، تو کہیں مردانہ سماج کا..... ساحر کی ہمدردی ایسی ہی مظلوم و مجبور عورت سے ہے جس کا کہیں نہ کہیں استحصال ہو رہا ہے۔ ساحر اپنی ایک نظم میں عورت کی اسی حالت پر افسوس کرتے ہیں۔

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقاں کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے

ساحر نظم ''چکلے'' میں عورت کی عصمت و عزت کو تار تار ہوتے دیکھ کر چیخ اٹھتے ہیں اور اپنی للکار کے ساتھ ''ثناء خوان تقدیس مشرق'' کو آواز دیتے ہیں۔

مدد چاہتی ہے یہ ہوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثناء خوانِ تقدس مشرق کہاں ہیں

ساحر نے ایسے بے رحم حالات کو بدلنا چاہا ہے۔ وہ سماج میں انقلاب لانا چاہتے ہیں تا کہ زمانہ عورت کو ہوس سے اور گندی نگاہوں سے نہ دیکھے۔ عورت کی عزت سے واقف ہو سکے۔ کیوں کہ ایک عورت اپنی ذات میں بہت سے رشتے رکھتی ہے اور وہ ماں ہے، بیٹی ہے، بہن اور بیوی ہے۔

16.4.4 ساحر کی سیاسی و انقلابی شاعری

ساحر نے جس وقت سیاسی و انقلابی نظمیں کہیں ان کے ذہن میں ملک و سماج کے حالات کے سبب بے قراری تھی۔ ان کی سیاسی نظموں میں کہیں مایوسی، غم اور افسوس ہے تو کہیں امید کی ایک کرن بھی ہے جسے ترقی پسند شاعری میں رجائیت کا عنصر کہا جاتا ہے۔ چونکہ ترقی پسند شاعر مایوس نہیں ہوتا وہ اپنی جدوجہد کے درمیان کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے اس لیے اس کے یہاں امید کا چراغ کبھی بجھتا نہیں، روشن رہتا ہے۔ ساحر کی سیاسی و انقلابی نظمیں ان کے داخلی (اندرونی) احساسات اور خارجی (باہری) حالات کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے دشمنوں یعنی انگریزوں کے ہاتھوں اپنے وطن کے لٹنے کا جو منظر دیکھا اسے اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کیا۔ ساحر نے اپنی نظم ''اجنبی محافظ'' میں انگریزوں کے ظلم و ستم کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ہندوستانیوں کی بدحالی و بے چارگی، مفلسی کی داستان ہے۔

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درخاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم

اسی ہوٹل کے قریب
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعت نایاب کہ جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے

ساحر کی شاعری میں جہاں غم وغصہ اور مایوسی ہے، وہیں آزادی حاصل کرنے کے لیے کچھ امیدیں بھی ہیں، کچھ خواب ہیں کہ ہم اپنی جدوجہد سے اپنی محنت اور مضبوط ومحکم ارادوں سے ایک نہ ایک دن آزادی حاصل کرلیں گے۔ ساحر نے ایک شعر میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔

ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

اس کے علاوہ ساحر کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' میں یہ تمام خصوصیات جن کا اس اکائی میں ذکر ہوا ہے یکجا نظر آئیں گی۔ نظم ''پرچھائیاں'' تیسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی تھی جس کا موضوع امن عالم تھا۔ اس میں رومانیت بھی ہے سیاست بھی۔ احتجاج بھی اور انقلاب بھی۔ ایک سو چوراسی (184) مصرعوں کی یہ نظم کہانی کی تکنیک لئے ہوئے ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. ساحر کی نظم پرچھائیاں کا موضوع کیا ہے؟ اور یہ نظم کس پس منظر میں لکھی گئی؟
8. ساحر کی نظم ''تاج محل'' کس نظریہ کی دین ہے؟
9. ساحر کی کسی انقلابی وسیاسی نظم کا نام لکھیے۔

16.5 نظم ''خون پھر خون ہے'' کا متن

ظلم پھر ظلم ہے ' بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ' ٹپکے گا تو جم جائے گا

خاک صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرق انصاف پہ ' یا پائے سلال پہ جمے
تیغِ بیداد پہ ' یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑھاتی رہیں ظلمت کے نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمت ناکارہ و رسوا سے کہو!
جبر کی حکمت پرکار کی ایما سے کہو!
محملِ مجلس اقوام کی لیلا سے کہو!

خون دیوانہ ہے ' دامن پہ ٹپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے ' خرمن پہ لپک سکتا ہے
تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ ' کہیں نعرہ ' کہیں خنجر بن کر

16.6 تشریح

ظلم پھر ظلم ہے.....جم جائے گا

نظم ''خون پھر خون ہے'' میں شاعر کا خیال ہے کہ ظلم آخر ظلم ہے جسے اک نہ اک دن ختم ہونا ہی پڑتا ہے۔اور اسے مظلوموں کے محکم ارادے اور احتجاج کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔کیونکہ ہر چیز کا عروج کے ساتھ زوال لازمی ہے۔ ظلم بھی جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو انقلاب کی آندھی اسے اڑا لے جاتی ہے۔مظلوموں کے خون میں اتنا جوش وخروش آ گیا ہے کہ وہ جہاں بھی گرے گا جم جائے گا' اپنا نشان چھوڑ جائے گا۔پھر وہ چاہے جنگل کی خاک پر جمے' انصاف کے ترازو پر جمے' قاتل کی ہتھیلی پر جمے یا پھر قدموں کے نیچے۔کہیں نہ کہیں اپنے دشمن کا پتہ بتانے کے لیے وہ اپنا نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔چاہے وہ ظالم کی یا قاتل کی تلوار ہی کیوں نہ ہو یا پھر مقتول کی مظلوم کی لاش ہو۔خون آخر خون ہے جہاں بھی ٹپکے گا جم جائے گا۔اور اپنے دشمن کا سراغ لگانے میں مدد کرے گا۔

لاکھ بیٹھے.....ہتھیلی پہ چراغ

اس بند میں شاعر کا اشارہ دشمن کی جانب ہے۔کوئی لاکھ چھپ کر پوشیدہ طریقہ سے گھات لگا کر بیٹھے۔خون جلادوں کے مسکن کا' جلادوں کے ٹھکانے کا اور ان کی قیام گاہ کا سراغ دے ہی دیتا ہے۔مظلوم ومجبور عوام جب احتجاج کے لیے سر اٹھاتے ہیں تو قاتل کا پتہ لگا ہی لیتے ہیں۔ہر جرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی پتہ کوئی' نہ کوئی نشان چھوڑ جاتا ہے کہ اس نشان کے ذریعہ مجرم تک قاتل تک پہنچا جا سکتا ہے۔مظلوموں کے خلاف کی گئی سازشیں' مظلوم کے قتل کے لیے بنائے گئے منصوبے کبھی کامیاب نہیں ہوتے انہیں کتنے دنوں تک اور کب تک چھپایا جا سکتا ہے کہ قاتل لاکھ اپنے منصوبوں کو' سازشوں کو چھپائے' پردے میں رکھے' اندھیرے میں وار کرتا رہے لیکن جب معصوم' بے گناہ' عوام ظلم کے خلاف نعرہ احتجاج بلند کریں گے تو ان کے خون کی ہر بوند چراغ کی طرح ان کی ہتھیلی پر روشن ہوگی اور اسی روشنی میں ہم مجرم وقاتل کے منصوبوں اور سازشوں کو جسے اس نے اپنے ظلم کے اندھیرے میں چھپا رکھا ہے' بخوبی دیکھ سکیں گے۔

ظلم کی قسمت ناکارہ.....لیلا سے کہو!

نظم کے اس بند میں شاعر کا لہجہ خطیبانہ ہو گیا ہے اور احتجاج کا آہنگ مزید بلند ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ظلم جس کی قسمت میں سوائے بے کاری، نامرادی اور بدنامی کے کچھ نہیں۔ اے میرے ہم وطنوں، اے میرے بھائیو، دوستو! اب وقت آ گیا ہے کہ تم ظلم کے بے کار بدنام عمل کو، ظلم کی اندھیری قسمت کو، بے جا تدبیر، گندی فطرت اور ظالم کے بدکار، بدنام اور ناپاک ارادوں کو یہ بتا دو، ظلم و جبر کو عقل و اشارہ دینے والوں اور بڑھاوا دینے والوں سے کہہ دو اور لیلا کی قوم یعنی ملک کی عورتوں سے بھی کہہ دو جو کہ اپنی قوم کی مجلس میں شامل ہوتی ہیں۔ اپنی قوم کی محفل میں ظالم و قاتل کی بدعنوانی پر باتیں کرتی ہیں۔ ان سے بھی یہ للکار کر کہہ دو کہ خون دیوانہ ہے۔ دامن پہ ٹپک سکتا ہے یعنی غریبوں کے خون میں اتنا جوش ہے اتنی گرمی ہے اور اپنی آزادی کی، اپنی اچھی حالت کی ایسی للک ہے، ایسی دیوانگی ہے کہ وہ تمہارے دامن پر ٹپک کر تمہارے جرم کو ظاہر کر دے گا۔ تمہاری بدکرداری کی شناخت کرائے گا۔ اس لیے اب بھی وقت ہے کہ ہوش میں آ جاؤ کیوں کہ یہ وہ خون ہے جو اب ظلم سہتے سہتے شعلہ بن چکا ہے اس شعلے کی لپٹیں اتنی تیز ہیں کہ وہ کھیت کھلیان کو بھی جلا سکتی ہیں۔ وہ کھلیان جس میں فصل پکتے ہی تم لوٹ لیتے ہو۔ سوچو کہ اگر یہ کھیت جل گئے تو تم کیا کھاؤ گے۔ لہٰذا اب تم مظلوموں کو آزاد کر دو۔ کیوں کہ وہ اب آگ کا گولہ بن چکے ہیں جو کسی کو بھی، مضبوط سے مضبوط ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔

تم نے جس.....خنجر بن کر

اس بند میں بھی شاعر کی آواز میں للکار ہے وہ کہہ رہا ہے اے ظلم کے پروردہ، ظالموں، قاتلوں تم نے جس خون کو، جس جوش کو، جس آواز کو قید خانے میں، قتل گاہ میں، مقتل میں دبانا چاہا وہ آج گلی محلوں اور بازاروں میں سرفروشی کا نعرہ لگاتے ہوئے نکل آتے ہیں یہ وہ احتجاجی و سرفروش لوگ ہیں جن کے سینوں میں ظلم و ستم کے خلاف آگ بھری ہے، زبان پر نعرہ ہے اور ہاتھوں میں خنجر.....آج یہ اپنے ہر ظلم کا بدلہ لینے پر آمادہ ہیں آج انہیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

نظم کے تینوں بند ساحر کی احتجاجی و انقلابی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں، جن میں شاعر نے ملک کی سماجی

بدحالی اور سیاسی بدعنوانیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ظالموں کے سیاسی مکر وفریب کو بے پردہ کیا ہے اور ہندوستانیوں کے مضبوط ارادوں کو جو فولاد کی طرح سخت اور مضبوط ہو چکے ہیں اجاگر کیا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے مختلف تحریکات وتنظیمات سے وابستہ لوگ کس طرح اپنے اپنے گھر سے ایک ساتھ مل کر بازاروں میں نعرۂ احتجاج لگاتے نکل آئے تھے اور سب نے ایک آواز ہو کر آواز اٹھائی تو آزادی مل ہی گئی۔ ظلم سے چھٹکارا مل ہی گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. نظم 'خون پھر خون ہے' کا پہلا شعر سنایئے۔
11. اس نظم کو کس قسم کی شاعری میں شامل کیا جا سکتا ہے؟
12. ساحر لدھیانوی نظریاتی طور پر کس تحریک سے وابستہ تھے؟

16.7 خلاصہ

ساحر لدھیانوی کی پیدائش 8 مارچ 1921ء کو لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ والد نے ساحر کا نام عبدالحئی رکھا۔ 1937ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور نتیجہ نکلنے سے قبل جب قدرے فرصت تھی انہیں دنوں پہلا شعر کہا۔ اقبال کے ایک شعر میں استعمال کیے گئے لفظ ''ساحر'' سے متاثر ہو کر اپنا نام وتخلص ساحر کر لیا۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' 1944ء میں منظر عام پر آیا۔ ساحر کے ذہن میں شروع سے ہی داخلی طور پر ترقی پسند نظریات کارفرما تھے۔ اس لیے وہ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن سے وابستہ ہو گئے۔ 1955ء میں ان کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' منظر عام پر آئی۔ امن عالم کے موضوع پر لکھی گئی یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔ 1971ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' شائع ہوا۔ ساحر ان چند شعرا میں سے ہیں جنھوں نے فلمی نغمہ نگاری کو بھی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے روشناس کرایا اور ان کے چوتھے مجموعے '' گاتا جائے بنجارہ'' کی اشاعت ہوئی۔ ساحر کی ادبی وفنی صلاحیتوں کی بنا پر انہیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ 25 اکتوبر 1980ء کو ساحر کا انتقال ہو گیا۔

نظم ''خون پھر خون ہے'' ساحر کی سیاسی وانقلابی نظم ہے جس میں شاعر کا خیال ہے کہ ظلم جب حد سے بڑھ

جاتا ہے تو ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کے خلاف ہر طرف آواز اٹھنے لگتی ہے اور پھر خون آخر خون ہے وہ جب بھی جہاں بھی ٹپکے گا جم جائے گا اور اپنا نشان اپنا پتہ چھوڑ جائے گا۔ چاہے وہ جنگل کی خاک پر جمے' قاتل کی ہتھیلی پر' انصاف کے ترازو پر' قدموں کے نیچے جمے' ظالم کی تلوار پر یا پھر گھائل کی لاش پر جمے خون جہاں بھی گرے گا جم جائے گا تا کہ اس کے نشان کے ذریعہ دشمن تک پہنچا جا سکے۔ دشمن کہیں سے بھی چھپ کر گھات لگا کر بیٹھے' خون اس کے ٹھکانے کا پتہ دے دیتا ہے۔ ظالم لاکھ کوششوں سے اپنی سازشوں کو چھپانا چاہے' مظلوم اپنی ہتھیلی پر اپنے خون کی ہر بوند سے چراغ جلا کر نکلتے ہیں اور اس کی روشنی میں ظالم کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اس لیے تم ظالموں سے جا کر کہدو کہ تم نے آج تک جس خون کو مقتل میں دبا دینا چاہا وہ آج نعرۂ احتجاج بلند کرتا بازاروں میں سڑکوں پر نکل آیا ہے اور وہ آج تمہارے ظلم کا تختہ پلٹ دے گا۔ اسے اب روکا نہیں جا سکتا۔

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. ساحر کی زندگی کا مختصراً جائزہ لیجیے۔
2. نظم ''خون پھر خون ہے'' کا مجموعی تاثر اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
3. ساحر کی شاعرانہ خصوصیات کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. ساحر کی حیات و خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کی نظم ''خون پھر خون ہے'' کا خلاصہ لکھیے۔
2. ساحر کی شاعرانہ خصوصیات پر مجموعی روشنی ڈالتے ہوئے اُن کی شاعری میں عورت کا مقام متعین کیجیے۔

16.9 فرہنگ

خاک صحرا	جنگل کی مٹی	کف قاتل	قاتل کی ہتھیلی

فرقِ انصاف	انصاف کے ترازو کے دونوں پلڑے		
تیغ بیداد	ظالم کی تلوار	پائے سلاسل	پاؤں کے نیچے
مسکن	رہنے کی جگہ	ظلمت	تاریکی، اندھیرا
رسوا	بدنام	حکمت	عقل یا طبابت
پرکار	دائرہ یا گھیرا کھینچنے کا آلہ	ایما	اشارہ، حکم، منشا
محمل	اونٹ کا کجاوہ	اقوام	قوم کی جمع
تند	تیز	خرمن	غلے کا ڈھیر، کھیت کھلیان
مقتل	قتل کرنے کی جگہ	کوچہ	محلّہ، باڑہ

6.10 معاون کتابیں

1. ساحرلدھیانوی ایک مطالعہ : مخمور سعیدی
2. ساحراوران کی شاعری : پرکاش پنڈت
3. ساحرلدھیانوی ہندوستانی ادب کے معمار : دیویندر ستیارتھی
4. ساحرلدھیانوی نئے ادب کے معمار (سیریز) : کیفی اعظمی

6.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. ساحر نے یہ نظم مقتول لومبا کی یاد میں کہی۔
2. ساحر 8 مارچ 1921ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔
3. ''تلخیاں'' کا سنِ اشاعت 1944ء ہے۔
4. ساحر نے ابتدائی تعلیم مالوہ خالصہ اسکول میں حاصل کی۔

5. ساحر کی سیاسی سرگرمیوں کے سبب انہیں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے نکال دیا گیا۔

6. ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' مجموعہ 1971ء میں شائع ہوا۔

7. ''پرچھائیاں'' کا موضوع امن عالم اور یہ تیسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی۔

8. ساحر کی نظم ''تاج محل'' ان کے اشتراکی نظریہ کی دین ہے۔

9. ساحر کی سیاسی و انقلابی نظم ''اجنبی محافظ'' ہے۔

10. ظلم پھر ظلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

11. احتجاجی و انقلابی شاعری

12. ترقی پسند تحریک

اکائی 8 : مخدوم محی الدین۔ ''چارہ گر''

ساخت

17.1 اغراض ومقاصد

17.2 تمہید

17.3 مخدوم محی الدین: حالاتِ زندگی

17.3.1 شخصیت

17.4 مخدوم محی الدین اور ترقی پسند تحریک

17.5 مخدوم کی نظم نگاری

17.5.1 رومانی شاعری

17.5.2 انقلابی شاعری

17.6 مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' کا متن

17.7 نظم ''چارہ گر'' کا خلاصہ

17.7.1 نظم ''چارہ گر'': تجزیہ

17.8 اکائی کا خلاصہ

17.9 نمونہ امتحانی سوالات

17.10 فرہنگ

17.11 معاون کتابیں

17.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

17.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کا مقصد آپ کو اُردو کے ایک معروف ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کی شخصیت اور شاعری سے واقف کرانا ہے۔ اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ مخدوم کی حیات، شخصیت، ترقی پسند تحریک سے اُن کی وابستگی اور اُن کی نظم نگاری کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔

17.2 تمہید

مخدوم محی الدین کا شمار اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو نظم گوئی میں نئے موضوعات اور ہیئت کے تجربے کرنے والے شاعروں میں مخدوم کا نام سرفہرست ہے۔ مخدوم کی شاعری رومان وانقلاب کا حسین سنگم ہے۔ عوام سے قریبی تعلق اور عوامی جدوجہد کے ذاتی تجربے کی وجہ سے ان کی انقلابی شاعری میں گھن گرج کی بجائے انسانی ہمدردی اور عالمی بھائی چارے کا پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔

17.3 مخدوم محی الدین: حالاتِ زندگی

مخدوم کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خدری ہے۔ وہ 4 فروری 1908ء کو تلنگانہ کے قصبے اندول ضلع میدک، آندھرا پردیش میں پیدا ہوئے۔ مخدوم کا شجرہ نسب حضرت ابوسعید خدری سے ملتا ہے جو آنحضرتؐ کے صحابی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم کے ددھیالی اجداد میں سے رشید الدین نامی ایک صاحب شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڑھ سے حیدرآباد آئے اور یہیں پر ہمیشہ کے لئے سکونت اختیار کر لی۔ مخدوم کے نانا سید جعفر علی کا تعلق بھی شمالی ہند سے تھا۔ وہ غدر کے ہنگاموں کی وجہ سے شاہ جہاں پور (یوپی) سے میدک آئے تھے۔

مخدوم کا خاندان مذہبی روایات کی پاسداری اور اپنی علمیت کی وجہ سے معزز وممتاز تھا۔ مخدوم کے والد غوث محی الدین تعلقہ اندول میں تحصیل کے اہلکار کے عہدے پر فائز تھے۔ چار سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور والدہ کی دوسری شادی کرادی گئی۔ جس کی وجہ سے مخدوم کا بچپن والدین کی شفقت سے محروم رہا۔ مخدوم کے چچا بشیر

الدین نے ان کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ چچا بھی والد کی طرح اہلکار تھے جو بعد میں تحصیل دار بنے۔ چچا کی مشفقانہ شخصیت کے زیرنگرانی مخدوم نے تربیت پائی۔ گھر کے مذہبی ماحول نے ان سے تمام دینی کام کروائے۔ نماز کی پابندی سے لے کر فرش کی صفائی' نمازیوں کے لئے وضو کے پانی کا انتظام' معزز بزرگوں کے احکام کی تکمیل غرض ایک فرمانبردار فرزند کی حیثیت سے مخدوم کا بچپن گزرا۔ عربی اور قرآن شریف کی تعلیم گھر پر حاصل کی' مخدوم نے تلگو زبان بھی سیکھی۔ مڈل اسکول کی تعلیم انہوں نے سنگاریڈی میں حاصل کی۔ پھر چچا کے ساتھ حیدرآباد آئے اور منشی کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں چچا کا تبادلہ میدک ہوا تو انھوں نے میدک سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ 1929ء میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد 1934ء میں بی۔اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور 1936ء میں ایم۔اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ تعلیم کے دوران مخدوم مالی مسائل سے دوچار ہوئے تو انہوں نے اپنے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے لئے ٹیوشن کئے۔ ایک صاحب کے لئے عشقیہ خطوط لکھے اور پانی کے برتن' تصاویر' پینٹنگز وغیرہ فروخت کئے اور مترجم کی حیثیت سے بھی انھوں نے کام کیا۔ 1939ء میں مخدوم کا تقرر بحیثیت لکچرر سٹی کالج' حیدرآباد میں ہوگیا۔ کوئی دوسال تک انھوں نے کام کیا۔ اسی دوران وہ سیاسی واشتراکی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے انھیں 1941ء میں ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

1925ء سے 1955ء تک مخدوم نے بیرونی ممالک کے کئی دورے کئے۔ یہ دورے امن کانفرنس' الیکشنوں اور ٹریڈ یونینوں کے عالمی فیڈریشن کی مختلف تقاریب کے سلسلے میں ہوتے تھے۔ مخدوم نے چین' سوویت یونین' مشرقی یورپ کے ممالک اور افریقہ کا بھی دورہ کیا۔ وہاں انھوں نے دوسری جنگ عظیم سے پیدا شدہ مسائل کا ذاتی مشاہدہ کیا اور ان مسائل کے حل کا جائزہ بھی لیا۔

اس دوران مخدوم کی شادی 22 اگست 1933ء کو ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے ہوگئی۔ مخدوم کے تین لڑکے محمد سعیدالدین' نصرت محی الدین' ظفرالدین اور دولڑکیاں ذکیہ بیگم اور رفیعہ بیگم ہوئیں۔ جن میں محمد سعیدالدین اور رفیعہ بیگم کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا۔

مخدوم کے ادبی سفر کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ انھوں نے بحیثیت شاعر طالب علمی کے زمانے میں ہی شہرت حاصل کر لی تھی۔ شاعری کے علاوہ مخدوم نے ڈرامے بھی لکھے۔ ''ہوش کے ناخن'' مرشد اور پھول بن ان کے ڈرامے ہیں۔ مخدوم نے 25 اگست 1969ء میں 61 برس کی عمر میں انتقال کیا۔

17.3.1 شخصیت

مخدوم نے متوسط طبقے کے ایک معزز اور وضع دار گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ چچا کی مشفقانہ شخصیت کے زیر سایہ انھوں نے تربیت حاصل کی۔ چچا کے خیالات اور برتاؤ سے وہ بہت متاثر تھے۔ مساوات اور انسان دوستی کے تصورات سے ان کا بچپن مالا مال تھا۔ چچا کی زندگی اور گھر کے ماحول نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں ایک اہم رول ادا کیا۔ ان کی شخصیت میں جو خودداری، خوش مزاجی، ملنساری، سادگی اور اخلاص و ہمدردی کے اوصاف ہیں وہ اسی پاکیزہ ماحول کی دین ہیں جو انھیں بچپن میں میسر ہوا۔

مجموعی حیثیت سے مخدوم کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر تھی۔ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خلوص و ہمدردی ان کی شخصیت کا جزو خاص تھی۔ ان کے لہجہ میں مٹھاس اور انداز گفتگو بڑی پرکشش تھی۔ اس لئے لوگ ان سے بہت جلد متاثر ہوتے اور دیر تک اس کا اثر ان پر قائم رہتا۔ مخدوم کی شخصیت کے بارے میں مجموعی حیثیت سے ہمیں داؤد اشرف سے متفق ہونا پڑتا ہے:

> ''مخدوم کی شخصیت میں بڑی جاذبیت ہے وہ صداقت پسندی اور خلوص کا پیکر ہیں۔ بحیثیت انسان مخدوم بڑے غیر معمولی انسان ہیں ان کی رفتار و گفتار اور طرز گفتگو میں غیر معمولی کشش ہے جو بھی ان سے ملتا ہے ان کی شخصیت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی ہر بات میں خلوص ہوتا ہے اس لئے ان سے ملنے پر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔'' (مخدوم ایک مطالعہ، 1969ء ص 47)

مخدوم کی شخصیت کئی اوصاف حمیدہ کی حامل تھی۔ ایک سچا ترقی پسند شاعر وہ ہوتا ہے جس میں عوام سے

ہمدردی اور اخلاص کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ بحیثیت انسان مخدوم میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک سچے شاعر اور عوام کے ہمدرد لیڈر میں ہونی چاہیے۔ مجموعی حیثیت سے مخدوم کی شخصیت بہترین اخلاق کی حامل تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. مخدوم محی الدین کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. مخدوم کی شخصیت کیسی تھی؟
3. شاعری کے علاوہ مخدوم نے کس صنف میں طبع آزمائی کی؟

17.4 مخدوم محی الدین اور ترقی پسند تحریک

مخدوم محی الدین کا شمار اُردو کے معتبر ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے گھر کا ماحول نہ صرف مذہبی تھا بلکہ اس میں انسان دوستی اور حب الوطنی کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ان کے چچا بچپن میں انھیں گاندھی جی، محمد علی جوہر اور بی اماں کے واقعات کے ساتھ ساتھ روس کے ظالم بادشاہ کے قصے بھی سنایا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہ کس طرح عوام نے اس ظالم بادشاہ کی حکومت کا خاتمہ کیا اور اپنی عوامی حکومت قائم کی اور کس طرح وہاں امیر اور غریب برابر ہو گئے۔ مخدوم کے چچا خود خلافت تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ اس طرح گھر کے ماحول اور چچا کی تربیت کا مخدوم کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔ ایسے ماحول میں پل کر جوان ہونے والا' ظاہر ہے عوام کی رہنمائی کا کام اپنے سر ضرور لے گا' چنانچہ مخدوم محی الدین خفیہ طور پر 1934ء میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے۔ ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام اپریل 1936ء میں ہوا جس میں علی گڑھ کے چند اشتراکی خیالات کے طلبا بھی شامل تھے۔ جن میں سبط حسن کا نام قابل ذکر ہے۔ سبط حسن اپنی تعلیم مکمل کر کے جب حیدرآباد پہنچے تو انھوں نے قاضی عبدالغفار کی مدد سے حیدرآباد کے ادیبوں کو اس تحریک سے روشناس کرایا۔ اس طرح سبط حسن کی کوششوں سے حیدرآباد میں ترقی پسند نوجوانوں کا ایک حلقہ وجود میں آ گیا۔ ان میں مخدوم محی الدین ایک سرگرم رکن تھے۔ ان ترقی پسند ادیبوں کی محفلیں عام طور سے نامور شاعرہ سروجنی نائیڈو کے مکان پر ''گولڈن تھریشولڈ'' میں منعقد ہوتی تھیں۔ 1940ء میں

جب حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو مخدوم اس کے ممبر ہو گئے اس زمانے میں تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی تھی اس لئے کمیونسٹ پارٹی بھی خفیہ طور پر کام کر رہی تھی۔ ان کی میٹنگیں بھی خفیہ ہوا کرتی تھیں۔

حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی عارضی انجمن پہلے سے موجود تھی لیکن اس کی باضابطہ تشکیل 1943ء میں ہوئی اور مخدوم پہلے کی طرح اس کے سرگرم رکن بنے رہے۔ ترقی پسند تحریک سے مخدوم کی وابستگی' مخدوم اور تحریک دونوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔

مخدوم نے عملی طور پر میدان سیاست میں قدم رکھا تو پہلے تو برطانیہ حکومت اور نظام حیدرآباد کی کھل کر مخالفت کی جس کی وجہ سے انھیں کئی مرتبہ جیل جانا پڑا اور روپوشی کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ 1946ء میں حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس کی صدارت کی اور انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اور پھر ضمانت پر رہائی حاصل ہوئی۔ پھر سیمنٹ فیکٹری ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان کے نام وارنٹ جاری ہوا تو وہ پارٹی کی ہدایت پر روپوش ہو گئے۔ اس طرح 1946ء سے 1951ء تک روپوش رہے۔ 1951ء میں جب کانگریس پارٹی برسر اقتدار آئی تو پارٹی کی مخالفت کے سلسلے میں انھیں 1951ء میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ 1952ء میں حلقہ شاہ بند سے اسمبلی اور حلقہ حیدرآباد سے لوک سبھا کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ لیکن انھیں دونوں حلقوں سے شکست اٹھانی پڑی پھر ضمنی انتخاب میں اسمبلی کے لئے حضور نگر سے کامیابی حاصل ہوئی۔

مخدوم ایک کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے تحریک کے سلسلے میں 9 مارچ 1953ء سے جولائی 1955ء تک ہندوستان سے باہر رہے۔ اس دوران ایشیا' یورپ اور افریقی ممالک کا دورہ کیا۔

اس طرح مخدوم کی ادبی اور سیاسی زندگی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ عملی طور پر سیاسی زندگی کے تجربات نے ان کی ادبی زندگی کو متاثر کیا۔ اس دوران انھوں نے کئی نظمیں لکھیں جن میں ترقی پسند اور اشتراکی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مخدوم عملی طور پر چونکہ عمر بھر مصروف کار رہے۔ اس لئے اُن کی بیشتر تخلیق عام طور پر چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے ہی ہوا کرتی تھی۔ ان کی بیشتر نظمیں ان کی اسی معروضیت کی دین ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک سے کب وابستہ ہوئے؟

5. کیا مخدوم کی سیاسی زندگی نے ان کی ادبی زندگی کو نقصان پہنچایا؟

6. مخدوم نے کس حلقۂ لوک سبھا سے چناؤ لڑا؟

17.5 مخدوم کی نظم نگاری

مخدوم کو شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا اور ان کی شاعری کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ مخدوم نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لیکن ان کی شہرت نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ ان کی پہلی نظم ''پیلا دوشالہ'' 1933ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ ایک مزاحیہ نظم ہے اس نظم کی وجہ سے مخدوم کو حیدر آباد کے ادبی حلقوں میں خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ مخدوم نے اپنی شاعری پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ وہ امیر مینائی کی غزلوں اور عظمت اللہ خاں کی نظموں سے بے حد متاثر تھے۔ ان کے علاوہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور حفیظؔ جالندھری، جوشؔ اور اخترؔ شیرانی سے بھی انھوں نے اثر قبول کیا۔

مخدوم کے تین شعری مجموعے ہیں۔

پہلا مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' 1944ء، دوسرا مجموعہ کلام ''گل تر'' 1961ء اور تیسرا مجموعہ کلام ''بساط رقص'' 1966ء میں شائع ہوا۔ ان کی بعض نظموں کے ترجمے ہندی، تلگو، مرہٹی، بنگالی کے علاوہ انگریزی، روسی اور جرمنی وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

17.5.1 رومانی شاعری

مخدوم کی ابتدائی شاعری میں رومان کی جھلکیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں طور، آتش کدہ، انتظار، سجدہ، جوانی اور ساگر کے کنارے وغیرہ میں داخلی جذبات و احساسات کا اثر زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ رومانی شاعری کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ حالات سے بیزار اور تخیل کی دنیا کا پروردہ ہوتا ہے۔ مخدوم بھی اسی طرح کے شاعر نظر آتے

ہیں۔ان کے بچپن اور جوانی کا زمانہ مایوسی اور ناامیدی میں گزرا۔ وہ بے شمار مسائل و مصائب کا شکار رہے لیکن ان کی شوخ طبیعت نے انھیں حالات کا گرویدہ ہونے کے بجائے زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا۔عنفوان شباب میں دیگر نوجوانوں کی طرح انھوں نے بھی سچا عشق کیا ہے اور اپنے عشق کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعہ کیا ہے۔مثلاً ان کی نظم ''طور'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

مخدوم نے اپنے قلبی واردات اور تجربات کو نہایت دلکش اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔انھوں نے فرسودہ مضامین اور کہی ہوئی باتوں کو دہرایا نہیں ہے بلکہ جب وہ اپنے واردات قلبی کو پیش کرتے ہیں تو ان کے انوکھے انداز اور سلیقے کی شگفتگی کی وجہ سے ان کی بات بالکل انوکھی اور نئی معلوم ہوتی ہے اور یہی مخدوم کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے کہ ان کے یہاں محبت کرنے کا انداز بھی بالکل جدا معلوم ہوتا ہے مثلاً:

نہ ماتھے پر شکن ہوتی جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

جو چھو لیتا میں اس کو' وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کا مزہ آتا تھا جینے میں

یہ اشعار مخدوم کی محبت کی پاکیزگی اور طہارت کی دلیل ہیں۔شاعر کا ذوق اور اس کے محبت کرنے کا انداز دیگر شعرا کے مقابلے میں نیا اور انوکھا معلوم ہوتا ہے۔

مخدوم کی رومانی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں غم ہجر کا احساس بھی ملتا ہے۔ انھیں محبوب کی یاد اس وقت شدت سے آتی ہے جب رات ہوتی ہے اور سارا عالم محوِ خواب رہتا ہے۔ ایسے میں عاشق، معشوق کی یاد میں تڑپتا ہے، بے چین و بے قرار رہتا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری میں ہمیں محبوب کی یاد ایک میٹھی چبھن کا احساس دلاتی ہے مثلاً نظم ''انتظار'' کا یہ شعر:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے جاتے رہے

مخدوم کی رومانی شاعری میں منظر کشی کے بہترین مرقع اور تشبیہات و استعارات کا حسن بھی ملتا ہے مثلاً نظم ''ساگر کے کنارے'' میں خاتون مشرق کی اداؤں، اس کی شوخی، شرم و حیا کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں کہ سارا نظارہ متحرک محسوس ہوتا ہے:

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے
انگشتریٔ حسن کے انمول نگینے
سر چشمے محبت کے مسرت کے خزانے
چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے
چہروں کو کبھی شرم سے آنچل میں چھپانا
گہہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

یہاں نہ صرف بہترین منظر کشی ملتی ہے بلکہ تشبیہات کا حسن بھی جھلکتا ہے۔ مثلاً ہندوستانی حسیناؤں کو کبھی حسن کی انگوٹھی کے انمول نگینے کہا گیا ہے تو کبھی شعلہ بدن، تو کبھی افلاک کے کھوئے ہوئے ستارے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہات ایک طرف شاعر کی زبان و بیان پر قدرت کا اظہار کرتی ہیں تو دوسری طرف اس کے جمالیاتی ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

مذکورہ بالا نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ نظم ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی عکاسی کرتی ہے، اسی طرح ایک اور نظم ''تلنگن'' ہے جس میں حسن و عشق کی جلوہ سامانی پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے:

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

مخدوم کی رومانی نظموں سے نہ صرف جمالیاتی کیفیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ایک نغمگی کی کیفیت بھی ملتی ہے ان کی بیشتر نظمیں ترنم سے پُر ہیں چاہے وہ ''چاند تاروں کا بن'' ہو یا ''چارہ گر''۔ ہر جگہ ہمیں غنائی کیف و سرور کا احساس ہوتا ہے اور یہی غنائی کیفیت، مخدوم کی رومانی شاعری کی جان ہے۔

مخدوم نے اپنی شاعری کی نغمگی و موسیقی کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے بغیر وزن والی نظموں کے بارے میں کہا ہے کہ:

''انگریزی میں ایسی شاعری کا رواج ہے۔ تلگو کا مہاکوی سری سری بھی بلا میٹر اور بلا

وزن کی نظمیں لکھتا ہے لیکن میں بلا وزن کی نظمیں نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ میرے شعروں
کی تخلیق موسیقی سے ہوتی ہے اور دل کی دھڑکن ہی میرے میٹر کا وزن ہوتی ہے۔''

(مخدوم سے انٹرویو' امیر عارفی' صبا مخدوم نمبر 1966ء ص 288)

مخدوم کو عنفوانِ شباب ہی میں حسن و عشق کے مراحل سے گزرنے کا ذاتی تجربہ ہوا۔ جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا ان کے تجربات وسیع تر ہوتے گئے۔ انھوں نے خود کو صرف حسن و عشق کے محدود دائرے تک محصور نہیں رکھا بلکہ خارجی دنیا کے مناظر پر بھی ان کی نظر رہی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی اور چونکہ عوامی جدوجہد اور عوامی انقلاب میں وہ بذات خود شریک رہتے تھے اس لئے ان کے تجربات کا حقیقی عکس ان کی نظموں میں جھلکتا ہے۔

17.5.2 انقلابی شاعری

مخدوم کی شاعری میں نہ صرف رومانی موضوعات ملتے ہیں بلکہ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ انقلابی آہنگ اور لب و لہجے سے پُر نظر آتا ہے۔ ان کی پہلی انقلابی نظم ''باغی'' ہے۔ نظم کے پہلے ہی بند میں ان کا جوش' خود پرستی' ولولہ انگیزی' ان کی تڑپ' ان کی سیمابی کیفیت اور ظلم کے خلاف لڑنے اور مرنے کا حوصلہ نظر آتا ہے۔ مثلاً:

رعد ہوں' برق ہوں' بے چین ہوں' یارا ہوں میں
خود پرستار' خود آگاہ' خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جود جلا دے وہ شرارا ہوں میں

شروع سے آخر تک نظم میں ایک باغیانہ کیفیت رواں دواں ہے جس میں ان کا غم و غصہ اور قدیم روایات کو توڑنے اور فرقہ وارانہ خیالات کو ختم کر دینے کا عزم نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو اک آگ بتاتے ہیں جو اِن فرسودہ خیالات کو جلا کر خاک کر دینا چاہتی ہے مثلاً:

آگ ہوں آگ ہوں یاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس، اب آگ لگانے دے مجھے

اسی طرح ان کی ایک اور نظم ''موت کا گیت'' بھی انقلابی کیفیت سے پُر ہے۔ ان کے علاوہ جنگ، مشرق حویلی، انقلاب، اندھیرا، زلف چلیپا، سیاہی، استالین اور جنگ آزادی بھی مخدوم کی کامیاب سیاسی اور انقلابی نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ نظم ''موت کا گیت'' مخدوم کی کامیاب انقلابی نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر کا انداز والہانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک استعاراتی نظم ہے جس میں شاعر استعاراتی انداز میں سرمایہ دارانہ اور اعلیٰ طبقہ کے خلاف باغیانہ جذبات کا اظہار کرتا ہے:

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے الاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

مذکورہ نظم میں جہاں شاعر کے جذبات ظلم کے خلاف آتش فشاں کی مانند پھٹے پڑتے ہیں، وہیں ان کا دل انسانی ہمدردی اور خلوص سے لبریز نظر آتا ہے۔ مخدوم کی انقلابی شاعری کے بارے میں داؤد اشرف رقم طراز ہیں:

''مخدوم کی انقلابی شاعری خلوص، یقین اور خود اعتمادی سے عبارت ہے۔ انھیں غربت اور غلامی اور سماج کی بے راہ روی اور گندگی سے نفرت ہے اور جب وہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو ان کا لب ولہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ ان کی چند نظموں میں جو ابتدائی دور کی ہیں، لہجے کا جلال، شعر پر غالب نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی شعریت ان کی انقلابی شاعری پر غالب ہے۔''

(داؤد اشرف، مخدوم ایک مطالعہ، 1967ء، ص 89)

مخدوم کی انقلابی نظموں میں استعاراتی انداز کے ساتھ ساتھ تشبیہات اور علامتوں کا استعمال بھی بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں انھوں نے آزادی کی جدوجہد اور اس کی خاطر کی گئی قربانیوں کی داستان بیان کی ہے اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے آزادی کے لئے کہی گئی ایک عرصہ دراز کی کوششوں کو سیاہ رات سے تشبیہ دی ہے اور آزادی کو انھوں نے صبح قرار دیا ہے۔

علامتوں کے سلسلہ میں ان کی اہم نظم ''حویلی'' ہے۔ حویلی کو مخدوم نے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یعنی حویلی انھوں نے اس فرسودہ سماج کو قرار دیا ہے جہاں امیری کے سبب اعلیٰ طبقہ کی حکومت ہے، جہاں سرمایہ داروں کا راج ہے اور جہاں کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کیا جارہا ہے۔ مخدوم اس نظم کے پردے میں آزادی کے متمنی ہیں اور ایسے سماج کے خواہاں ہیں جہاں ہر انسان خوشی سے زندگی بسر کر سکے۔

مخدوم کی نظموں میں ہمیں منظر کشی کے عمدہ نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ نظم ''آسمانی لوریاں'' میں جگہ جگہ انھوں نے منظر کشی سے کام لیا ہے مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

روز روشن جا چکا ' ہیں شام کی تیاریاں
اڑ رہی ہیں آسماں پر زعفرانی ساریاں
شام رخصت ہورہی ہے رات کا منھ چوم کر
ہو رہی ہیں چرخ پر تاروں میں کچھ سرگوشیاں
جلوے ہیں بے تاب پردے سے نکلنے کے لئے
بن سنور کر آرہی ہیں آسماں کی رانیاں
نو عروس شب نے پہنا ہے لباس فاخرہ
آسمانی پیرہن میں کہکشانی دھاریاں

تمام نظم اسی طرح کی کیفیت سے پُر ہے۔ یہ نظم منظر کشی کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

مخدوم کی انقلابی نظموں میں کہیں کہیں باغیانہ جذبات اور انقلابی آہنگ ضرور نظر آتا ہے لیکن اس سے ان کے لہجہ میں گھن گرج یا نعرہ بازی نہیں ملتی بلکہ غنائیت اور ترنم کے ساتھ جدوجہد کا حوصلہ اور مستقبل پر یقین ملتا ہے اور یہی ان کی انقلابی شاعری کی خصوصیت ہے۔

مخدوم محی الدین کے یہاں نظم کی ہیئت اور اسلوب کے کامیاب تجربے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً پابند نظم، معریٰ نظم، آزاد نظم اور نثری نظم۔ زیادہ تر ان کے یہاں آزاد نظمیں ملتی ہیں۔ ان کے اسلوب اور طرز بیان کی خوبی یہ ہے کہ وہ آزاد نظموں میں بھی ترنم اور غنائیت کا عنصر ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ نظم ''چاند تاروں کا بن'' اور ''چارہ گر'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

مجموعی حیثیت سے مخدوم کی نظموں میں ایک طرح کا توازن ملتا ہے۔ ان کے لہجے کی نرمی اور مٹھاس اور عوام سے قریبی تعلق اور ہمدردی کی بدولت ان کی انقلابی نظموں میں بھی گھن گرج اور سختی کی بجائے گہرا سماجی شعور اور حالات کو بدل دینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری رومان و انقلاب کا حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔

مخدوم کا رویہ معتدل اور اپروچ سائنٹفک ہے۔ اشتراکی انقلاب میں انھیں یقین ہے۔ ان کی یہی آرزو ہے کہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے اور ساری دنیا پر عوام کی حکومت قائم ہو جائے لیکن باوجود اس انقلابی نظریے کے، ان کے یہاں حال سے بیزاری، خوش آئند دنوں کی امید، ماحول اور زندگی کو بدل دینے کی خواہش اور ولولہ نظر آتا ہے۔ اپنے نظریات و خیالات کو وہ خلوص دل کے ساتھ فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں مخدوم نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔ ان کے یہاں آزاد و پابند نظم کے تجربوں کے علاوہ زبان و بیان کی سادگی و پرکاری، جمالیاتی رچاؤ، تشبیہوں و استعاروں اور علامتوں کا عمدہ استعمال، نغمگی و ترنم کی کیفیت اور انتہائی غم میں بھی مایوسی و دل شکنی کی بجائے زندگی کو بہتر طریقے پر برتنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو مخدوم محی الدین کو بلاشبہ اردو کے ترقی پسند شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. مخدوم کی کسی علامتی نظم کا نام بتایئے۔

8. مخدوم کی پانچ نظموں کے نام لکھیے۔

9. مخدوم کے کتنے شعری مجموعے شائع ہوئے اور اُن کے نام کیا ہیں؟

10. مخدوم کی شہرت اور شناخت اُردو شاعری کی کس صنف کی وجہ سے ہے؟

17.6 مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' کا متن

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرف وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا
دو بدن
اوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر

ایک پل کے لئے رک گئی
ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور وظلمات میں

مسجدوں کے میناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
میکدوں کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر!

17.7 نظم ''چارہ گر'' کا خلاصہ

نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کی بے حد مقبول نظم ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے جو ان کے دوسرے مجموعہ کلام

''گل تر'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اس فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ وہ قارئین کے دلوں پر اپنا ایک خاص اثر قائم کرتی ہے۔ اس نظم کا موضوع محبت ہے جو صرف دو پیار کرنے والوں کی محبت اور اس کے المناک انجام کو پیش کرتی ہے۔

اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ دو پیار کرنے والے ایک خوشبودار چنبیلی کے منڈوے تلے، جو میکدے سے ذرا دور واقع ہیں، اپنی محبت کو قربان کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ محبت کرنے والوں کو کبھی وصل نصیب نہیں ہوا۔ ان کی تقدیر میں صرف جدائی لکھی ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ محبت کرنے والے عشق میں اس قدر گرفتار ہیں کہ محبت ہی ان کا ایمان ہے، محبت ہی ان کی زندگی ہے، دن رات سوائے محبت کے انھیں کوئی کام نہیں ہوتا، چاہے وہ ٹھنڈی شبنمی صبح ہو یا اندھیری رات۔ انھیں محبت کے علاوہ کسی چیز کی سدھ بدھ نہیں ہوتی۔ آگے شاعر کہتا ہے کہ جب یہ محبت کرنے والے نہیں ہوتے تو پھر یہ چمن کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضائیں بھی مغموم ہو جاتی ہیں اور ماتم کرنے لگتی ہیں۔

مخدوم کا کہنا ہے کہ ہم نے ان دو پیار کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ ہم نے انھیں ہر حال میں دیکھا ہے۔ ہم نے انھیں صبح وشام دیکھا ہے۔ خوشی میں دیکھا ہے اور غم کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔ نہ صرف ہم بلکہ ان کی محبت کی گواہ مسجد کی مینار بھی ہیں، مندر کے کواڑ بھی ہیں اور میکدے کی دراڑ بھی ہیں۔ یعنی انھیں محبت میں گرفتار مذہبی رہنماؤں نے بھی دیکھا ہے اور عیش پرست رندوں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ لوگ آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے محبت کرنے والوں کے گواہ ہیں جب کہ دنیا کی ابتدا ہوئی تھی اور یہ اس وقت تک ان کے گواہ رہیں گے جب تک دنیا قائم رہے گی لیکن محبت کرنے والوں کا ہمیشہ ایک ہی جیسا انجام ہوتا رہے گا۔ انھیں چین اور سکون نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی علاج نہیں ہوگا۔ پھر شاعر اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتا ہے کہ ''اے چارہ گر'' تیرے پاس تو دنیا کے تمام غموں کا علاج ہے تو پھر تیرے پاس کیا محبت کا کوئی کامیاب نسخہ نہیں؟ کیا تیرے پاس محبت کی کوئی ایسی دوا نہیں ہے جس سے اس کا علاج ممکن ہو سکے؟ اگر ایسا کوئی علاج ہے تو ذرا بتا دے ورنہ محبت کا پھر وہی انجام ہوگا جو صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے یعنی پھر سے دو بدن محبت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنی محبت کی ناکامی کے آنسو بہائیں گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس محبت کی آگ

میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔

17.7.1 نظم ''چارہ گر'': تجزیہ

مخدوم ایک انقلابی شاعر ہیں تاہم ان کے یہاں رومانی اثرات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری کو رومان و انقلاب کا حسین امتزاج کہا گیا ہے۔ مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' ایک رومانی نظم ہے لیکن اس میں ایک باغیانہ کیفیت بھی ہمیں ملتی ہے۔

مخدوم کے یہاں ہمیں محبت کا وہ روایتی و فرسودہ انداز نہیں ملتا۔ جہاں شاعر رقیب کی شکایت کرتا ہے یا ہجر کا رونا روتا ہے یا پھر شیخ یا واعظ کی غیبت کرتا ہے۔ بلکہ انھوں نے محبت کا ایک نیا اور واضح تصور دیا ہے۔ انھوں نے محبت اور اس کے انجام کو موضوع بنایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زمانے نے محبت کی کبھی قدر نہیں کی ہے۔ زمانہ اور سماج صدیوں سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں۔ چاہے مذہبی رہنما ہوں یا سماج کے ٹھیکیدار جو عیش و عشرت کے نشے میں چور ہیں وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دو پیار کرنے والے افراد کس قدر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں' انھیں ملنے نہیں دیتے اور اس طرح محبت کا انجام دو محبت کرنے والوں کی ایثار و قربانی کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہاں مخدوم نے مندروں کی کواڑوں' مسجد کے میناروں اور میکدے کی دراڑوں کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ یہ وہ علامتیں ہیں جن سے ہمارا سماج یا معاشرتی نظام متاثر ہے۔ یعنی ان کے نزدیک چاہے مذہبی رہنما ہو یا اعلیٰ طبقہ جو دولت کے نشے میں ڈوبا ہوا ہے' سب ہی محبت کرنے والوں کے ہمیشہ سے دشمن رہے ہیں اور انہیں کے آگے محبت نے دم توڑی ہے۔

یہ نظم محبت کے اس المناک انجام کو پیش کرتی ہے جو ازل سے ابد تک سماج کا پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ محبت کو کبھی اس کی منزل نہیں ملی اور نہ ہی محبت کرنے والوں کا کوئی پُرسان حال رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج کے لئے محبت ہمیشہ سے ایک چیلنج بنی رہی ہے۔ اور ہر محبت کرنے والا اس چیلنج کا بخوبی مقابلہ کرتا ہے۔ عالم خوندمیری نے بھی یہی بات بتائی کہ یا تو محبت سماج کے لئے چیلنج رہی یا پھر سماج اس کے لئے ایک چیلنج رہا۔ لکھتے ہیں:

''یہ وہ محبت ہے جو زندگی کو جہنم بنادیتی ہے۔ اور جس کا انجام ''موت'' ہے۔ یہ انسان کی خودتخریبی (Self Destruction) میلانات کی آفریدہ ہے اور اسی لئے یہ محبت ہر سماج کے لئے ایک چیلنج ہے یا ہر سماجی تنظیم ایسی محبت کے لئے چیلنج بن جاتی ہے۔'' (صبا، مخدوم نمبر اکتوبر نومبر دسمبر 1966، ص 87)

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو پیار کرنے والوں کے لئے پھول بن جاتا ہے تو کبھی انگارہ۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے اکثر اس کو آگ سے تشبیہ دی ہے مثلاً جگرؔ مرادآبادی نے کہا ہے:

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

یا پھر غالبؔ کا یہ شعر:

عشق پر زور نہیں، ہے وہ یہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مخدوم کے یہاں بھی ہمیں محبت کا وہ روپ ملتا ہے جہاں عاشق و معشوق پیار کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ان کی محبت کی یہ ہمہ گیری موت کو بھی اپنی آغوش میں لینے کا متمنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ان گرفتار محبت کے طلبگاروں کے لئے کہتا ہے کہ محبت ہی ان کا سب کچھ ہے۔ ان کا ایمان، ان کی وفا اور ان کی چتا یعنی محبت کرنے والوں کے نزدیک سوائے محبت کے ہر چیز بے معنی ہے۔ اس قدر محبت میں سرشار دو دلوں کو کبھی ان کی منزل نہیں ملتی اور ان کی محبت کا انجام سوز، تڑپ جلن اور بے چینی و اضطراب کی صورت میں انھیں ملتا ہے۔ اسی لئے شاعر سوال کرتا ہے اور ''چارہ گر''، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے سوال کرتا ہے کہ کیا اس غم محبت کا کوئی علاج نہیں؟ کیا کوئی ایسا مسیحا نہیں ہے جو اس درد کی دوا بتائے جیسا کہ غالبؔ نے بھی کہا ہے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

چنانچہ مخدوم بھی سوال کرتے ہیں؛

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج وادوائے الفت بھی ہے

اس طرح نظم کا اختتام سوالیہ انداز میں ہوتا ہے جہاں شاعر محبت کی اس نازک اور پیچیدہ گتھی کو سلجھانا چاہتا ہے جو کش مکش حیات میں ازل سے ابد تک ہمیشہ برقرار رہی ہے اور رہے گی۔

نظم ''چارہ گر'' ان کی رومانی نظموں میں بلاشبہ فنی اعتبار سے ایک کامیاب نظم ہے۔ کیوں کہ انھوں نے یہ نظم اس وقت لکھی جب ان کے شعور کی پختگی کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین اور ناقدین نے اس نظم کو ان کے ذہنی پختگی کے دور کی نظم قرار دیا ہے۔ بلاشبہ مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' ان کی رومانی نظموں میں ایک اہم نظم ہے۔ جس سے ان کے ذہنی ارتقا اور پختگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور محبت کا ایک نیا اور واضح تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں محبت کے خوشگوار انجام کی آرزو، خوش آئند مستقبل کی جستجو نظر آتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

11. نظم ''چارہ گر'' مخدوم کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟
12. نظم ''چارہ گر'' کا موضوع کیا ہے؟ یہ کس قسم کی نظم ہے؟

17.8 اکائی کا خلاصہ

مخدوم محی الدین 4 فروری 1908ء کو ضلع میدک، آندھرا پردیش میں پیدا ہوئے۔ نماز کی پابندی سے لے کر فرش کی صفائی، نمازیوں کے لئے وضو کے پانی کا انتظام، معزز بزرگوں کے احکام کی تکمیل غرض ایک فرمانبردار فرزند کی حیثیت سے مخدوم کا بچپن گزرا۔ 1939ء میں مخدوم کا تقرر بحیثیت لکچرر سٹی کالج، حیدرآباد میں ہوگیا مگر جلدی ہی وہ

مستعفی ہوگئے۔مخدوم کے ادبی سفر کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا۔شاعری کے علاوہ مخدوم نے ڈرامے بھی لکھے۔مخدوم نے 25 اگست 1969ء میں 61 برس کی عمر میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔

مخدوم کی شخصیت میں خودداری، خوش مزاجی، ملنساری، سادگی اور اخلاص و ہمدردی کے اوصاف ہیں۔مجموعی حیثیت سے مخدوم کی شخصیت بڑی جاذب نظر تھی۔جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خلوص و ہمدردی ان کی شخصیت کا جزو خاص تھی۔

مخدوم محی الدین کا شمار اُردو کے معتبر ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔1940ء میں جب حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو مخدوم اس کے ممبر ہوگئے۔انھیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے کئی مرتبہ جیل جانا پڑا اور روپوشی کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔مخدوم نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لیکن ان کی شہرت نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔مخدوم کے تین شعری مجموعے ہیں۔پہلا مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' 1944ء ' دوسرا مجموعہ کلام ''گل تر'' 1961ء اور تیسرا مجموعہ کلام ''بساط رقص'' 1966ء میں شائع ہوا۔

ترقی پسند شاعروں میں مخدوم نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔ان کے یہاں آزاد و پابند نظم کے تجربوں کے علاوہ زبان و بیان کی سادگی و پرکاری، جمالیاتی رچاؤ، تشبیہوں و استعاروں اور علامتوں کا عمدہ استعمال، نغمگی و ترنم کی کیفیت اور انتہائی غم میں بھی مایوسی و دل شکنی کی بجائے زندگی کو بہتر طریقے پر برتنے کا حوصلہ ملتا ہے۔اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو مخدوم محی الدین کو بلاشبہ اردو کے ترقی پسند شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کی بے حد مقبول نظم ہے۔یہ ایک آزاد نظم ہے جو ان کے دوسرے مجموعہ کلام ''گل تر'' میں شامل ہے۔اس نظم میں شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس فنکارانہ انداز میں کیا ہے کہ وہ قارئین کے دلوں پر اپنا ایک خاص اثر قائم کرتی ہے۔اس نظم کا موضوع محبت ہے جو صرف دو پیار کرنے والوں کی محبت اور اس کے المناک انجام کو پیش کرتی ہے۔

17.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. مخدوم محی الدین کے حالات زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالیے۔
2. مخدوم کی نظم نگاری کا جائزہ لیجیے۔
3. مخدوم کی نظم میں رومان وانقلاب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وضاحت کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' کا خلاصہ لکھیے۔
2. مخدوم کی حیات وشخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کی نظم ''چارہ گر'' کا تنقیدی تجزیہ پیش کیجیے۔
3. مخدوم کی رومانی وانقلابی شاعری کے حوالے سے اُن کی شاعرانہ خصوصیات اُجاگر کیجیے۔

17.10 فرہنگ

اشتراکی	کمیونسٹ نظریہ کا حامی		
اضطراب	بے تابی، بیقراری، گھبراہٹ		
المناک	دردناک	تخیل	خیال
پختگی	مضبوطی، پکاپن	دل شکنی	دل توڑنا
چارہ گر	طبیب، معالج، علاج کرنے والا	عزم	ارادہ
رمزیت	اشاریت، آنکھوں یا بھوؤں کا اشارہ		
معتدل	اعتدال والا، اوسط درجہ کا، متوسط		
مشفقانہ	دردمندانہ، محبانہ، دوستانہ	سیمابی کیفیت	بیتابی کی کیفیت
عنفوان شباب	جوانی کا آغاز	غنائی کیفیت	نغمگی کی کیفیت

جلا بخشنا	روشنی دینا، چمک دینا، رونق دینا		
فرسودہ	گھِسا ہوا، پرانا، گیا گزرا، بوسیدہ		
قارئین	پڑھنے والے	قلبی واردات	دلی کیفیات

17.11 معاون کتابیں

1. سرخ سویرا : مخدوم محی الدین
2. گل تر : مخدوم محی الدین
3. بساط رقص : مخدوم محی الدین
4. مخدوم ایک مطالعہ : داؤد اشرف
5. مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے : شاذ تمکنت

17.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. مخدوم محی الدین کی پیدائش 4 فروری 1908ء کو ضلع میدک، آندھرا پردیش میں ہوئی۔
2. مخدوم کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ صداقت پسندی اور خلوص کے پیکر تھے۔
3. شاعری کے علاوہ مخدوم نے ڈرامے لکھے۔
4. 1940ء میں
5. ہاں، مخدوم کی سیاسی زندگی نے اُن کی ادبی زندگی کو نقصان پہنچایا۔
6. حلقہ حیدرآباد سے
7. حویلی
8. پیلا دوشالہ، آتش کدہ، ساگر کے کنارے، چارہ گر، باغی

9. مخدوم کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے جن کے نام سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص ہیں۔

10. نظم

11. نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کے دوسرے مجموعہ کلام ''گل تر'' میں شامل ہے۔

12. اس کا موضوع محبت ہے اور یہ ایک رومانی نظم ہے۔

اکائی 9 : کیفی اعظمی اور ان کی نظم ''مکان''

ساخت

18.1 اغراض ومقاصد

18.2 تمہید

18.3 کیفی اعظمی کی حیات

18.4 کیفی کی شاعرانہ خصوصیات

18.4.1 کیفی کی شاعری کا پہلا دور۔ رومانی شاعری

18.4.2 کیفی کی شاعری کا دوسرا دور۔ احتجاجی، سیاسی اور انقلابی شاعری

18.4.3 کیفی کی شاعری کا تیسرا دور۔ سماجی وعوامی شاعری

18.5 نظم ''مکان'' کا متن

18.6 تشریح

18.7 نظم کا خلاصہ

18.8 اکائی کا خلاصہ

18.9 نمونہ امتحانی سوالات

18.10 فرہنگ

18.11 معاون کتابیں

18.12 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

18.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ کیفی اعظمی کی نظم ''مکان'' کے مقصد ومطلب اور خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے

مطالعہ کریں گے۔ نظم کا مقصد ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب دنیا نئے نئے تجربات اور تعمیرات سے گزر رہی ہے۔ سیاست دانوں کے ہزاروں وعدوں اور دعوؤں کے باوجود لاکھوں کروڑوں لوگ بے گھر ہیں۔ وہ فٹ پاتھ پر اور جھگّی جھونپڑیوں میں حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہیں۔ ہمیں ان کے متعلق سوچنا ہے کہ انسان اور کائنات کے بارے میں انسان ہی سوچتا آیا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔

اکائی کے مطالعے سے آپ نہ صرف یہ کہ کیفی اعظمی کے مختصر حالات زندگی سے واقف ہو جائیں گے بلکہ ان کی شاعری کے مختلف ادوار کی خصوصیات سے بھی آپ کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔ نظم ''مکان'' کی تشریح سے آپ کو اس نظم کے موضوع اور فنی و شعری خوبیوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

18.2 تمہید

کیفی اعظمی نے نظم ''مکان'' مدن پورہ ممبئی کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لکھی تھی۔ یہ نظم سیاسی اور سماجی منظر نامے کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے جب انسان کے پاس رہنے کو مکان کا تصور بھی نہیں تھا اس وقت انسان کس طرح زندگی گزارتا تھا۔ وہ گپھاؤں میں، جنگل میں رہتا تھا لیکن جیسے جیسے اس نے ترقی کی راہوں پر قدم رکھا اُسے روٹی، کپڑے کے ساتھ جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوئی وہ مکان ہے۔ جس کا خواب انسان کی آنکھوں میں پلتا رہتا ہے۔ جسے بنانے کے لیے وہ بے پناہ محنت و مشقت کرتا ہے بہت جدوجہد اور کوشش کرتا ہے اور جب مکان بنالیتا ہے تو اسے سجاتا سنوارتا ہے اسی میں جینا مرنا چاہتا ہے۔ آج مکان کے بغیر جینے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ آج جب ہم میلوں کا سفر لمحوں میں طے کر رہے ہیں، مشینوں کے ذریعہ نئے نئے تجربے کر رہے ہیں وہیں ہم میں انسانیت کم ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں ان مفلس و نادار لوگوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے جو تعمیرات کے اس درخشاں دور میں فٹ پاتھ پر رہنے کو مجبور ہیں کیونکہ ان کے پاس مکان نہیں ہے۔ نہ جانے کتنی حکومتیں آئیں، غریبوں، مفلسوں سے انھیں گھر مکان دینے کے لیے وعدے کیے گئے اور جب سیاسی لیڈران اقتدار و حکومت میں آگئے تو سب بھول گئے اور غریبوں، ناداروں کی دلی حسرتیں دل میں ہی رہ گئیں۔ ان کے لئے فٹ پاتھ ہی ان کا گھر ہے، ان کی

جائیداد ہے۔ آگ برساتا آسمان ان کی چھت ہے اور تپتی زمین ان کا فرش۔

18.3 کیفی اعظمی کی حیات

مشرقی یوپی کے اعظم گڑھ ضلع کی پھول پور تحصیل سے 6-5 کلومیٹر کی دوری پر ایک چھوٹا سا گاؤں مجواں ہے۔ مجواں کے ہی ایک زمیں دار گھرانے میں 19 جنوری 1919ء کو کیفی اعظمی کی پیدائش ہوئی۔ والد کا نام فتح حسین اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ والدین نے ان کا نام اطہر حسین رکھا۔ اور اسی اطہر حسین نے آگے چل کر کیفی اعظمی کے نام سے ادبی دنیا میں بالعموم اور ترقی پسند شاعری میں بالخصوص بے پناہ شہرت حاصل کی۔ وہ بچپن سے ہی بہت سنجیدہ اور جذباتی تھے۔ بچپن میں عید کے دن نئے کپڑے اس لئے نہیں پہنتے تھے کہ ان کے گاؤں کے کسان بچوں کے پاس نئے کپڑے نہیں تھے۔ گھر میں ہی شعر و شاعری کا ماحول تھا۔ چونکہ والد بہت باذوق آدمی تھے اس لئے اکثر گھر پر شاعروں کا مجمع لگا رہتا۔ محفلیں اور نشستیں ہوتیں، محرم میں مجلس، قصیدہ اور مرثیہ کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ کیفی کے بھائی وغیرہ بھی شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ انھیں وراثت میں شاعری کا فن ملا تھا۔ اس لئے 8 برس کی عمر میں ہی اشعار کہنے لگے تھے۔ تقریباً گیارہ برس کی عمر میں مشاعرہ میں پہلی دفعہ غزل پڑھی۔ اس غزل کا مطلع تھا:

اتنا نہ زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے

اس غزل نے مشاعرہ لوٹ لیا اور وہیں پر ان کے والد نے خوش ہو کر انھیں شاعرانہ نام کیفی سے نوازا۔ ابتدا میں عربی فارسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا وقت آیا تو والدین نے فیصلہ کیا کہ انھیں جدید تعلیم کی بجائے دینی و مذہبی تعلیم دلائی جائے۔ اس غرض سے کیفی کا داخلہ لکھنؤ کے سب سے بڑے مدرسے سلطان المدارس میں کرا دیا گیا۔ مگر مدرسے کے حالات انھیں راس نہیں آئے۔ مولویوں اور مدرّسوں کی بدعنوانی پر ان سے رہا نہیں گیا اور انھوں نے مدرسہ کے نظام کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ یہ زمانہ تقریباً 30-1929 کے آس پاس کا ہے۔ اس دوران وہ لکھنؤ سے کانپور چلے آئے تھے۔ یہیں سے ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ ملک اور سماج کی فکر نے ان

کے سیاسی و انقلابی مزاج میں گرمجوشی پیدا کی اور عوام کے درد نے ان کے سماجی شعور کو نئی جلا بخشی۔ اسی زمانے میں کیفی نے نظم ''اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے'' کہی تھی۔

کیفی اعظمی دردمند اور حساس طبیعت کے انسان تھے اس لئے وہ بہت جلد لوگوں کی مصیبتوں، پریشانیوں، بھوک، افلاس، بے روزگاری، قوم کی بدحالی اور ملک کی بربادی سے متاثر ہو جاتے تھے جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا موجود ہے۔ اسی زمانے میں روس میں انقلاب آچکا تھا۔ وہ اس دوران 'قومی جنگ' بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے جو مزدوروں کسانوں کی حمایت کرتا تھا چنانچہ وہ 'قومی جنگ' کے ادارے میں اپنی نظمیں جو روس کی حمایت میں تھیں بھیجنے لگے۔ یہ نظمیں بڑی پسند کی جاتیں۔ ایک دن لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں کیفی کی ملاقات سردار جعفری اور سجاد ظہیر سے ہوئی۔ ان لوگوں نے کیفی سے ممبئی چلنے کو کہا۔ اور وہ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود تیار ہو گئے اور ممبئی چلے آئے۔ یہاں کمیونسٹ پارٹی نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ پارٹی کے ہول ٹائمر ہو گئے۔ یہیں سے انھوں نے شہرت کی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا اور پارٹی نے ہی کیفی اعظمی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' 1943ء میں شائع کیا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہیں ان کی ملاقات شوکت خانم سے ہوئی۔ اور گھر والوں کے اختلاف کے باوجود کیفی نے 23 مئی 1947ء کو شوکت سے شادی کر لی۔ زندگی کا سفر خوشگواری کے ساتھ زندگی کی نرم و گرم صورتوں کے باوجود چلتا رہا کیونکہ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کی شریک حیات تھیں۔ ممبئی میں وہ 'اپٹا' سے وابستہ ہو گئے اور جلد ہی ان کی فعالیت، جدوجہد اور محنت کو دیکھتے ہوئے انھیں 'اپٹا' کا صدر اور 'نیا ادب' کا مدیر بنا دیا گیا۔ کیفی نے اپٹا کے لئے بہت سے گیت اور ڈرامے لکھے۔

جھنکار کے بعد کیفی اعظمی کا دوسرا مجموعہ ''آخر شب'' 1947ء میں شائع ہوا پھر ایک طویل مدت کے بعد 1973ء میں مجموعہ ''آوارہ سجدے'' کی اشاعت ہوئی۔ اور اسی برس کیفی فالج کا شکار ہو گئے۔ اور پھر اپنے گاؤں مجواں چلے آئے جہاں ان کے ساتھ شوکت کیفی بھی تھیں۔ انھیں اپنے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں سے بے حد پیار تھا۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی زمین تھی۔ اپنے لوگ تھے۔ اور اب وہ مجواں کی ترقی کا خواب دیکھنے لگے۔ 1943ء سے 1973ء تک

ان کی زندگی میں کافی اتار چڑھاؤ آئے مگر کیفی نے ہمت نہیں ہاری۔ اسی بیچ ممبئی میں قیام کے دوران وہ فلم انڈسٹری سے منسلک ہو گئے۔ اور فلم حقیقت، نونہال، ایک کے بعد ایک، ہیر رانجھا، ہنستے زخم وغیرہ کے لئے نغمے لکھے۔ جو بہت مقبول ہوئے۔ 1974ء میں ان کے فلمی نغموں کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' شائع ہوا۔ جس میں ان کے تقریباً 240 گانے شامل ہیں۔ 1983ء میں ابلیس کی مجلس شوریٰ چھپ کر آئی۔ کیفی اعظمی تقریباً ایک دہائی تک ممبئی سے نکلنے والے اخبار Bilitz میں طنزیہ کالم لکھتے رہے۔ یہ ان کی نثری تخلیق تھی۔ جو 2001ء میں ''نئے گلستاں'' کے نام سے شائع ہوئی۔ کیفی کے دو ڈرامے 'ہیر رانجھا' اور 'زہر عشق' بھی شائع ہو چکے تھے۔ جس پر بعد کو فلم بنائی گئی۔

کیفی کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ پیر کے تین تین فریکچر اور فالج کے باوجود وہ زندگی کی آخری سانس تک سماج کی، گاؤں کی ترقی کی کوشش کرتے رہے اور لکھتے رہے۔ مجواں کی ترقی میں کیفی کا بہت بڑا رول رہا۔ سڑک، اسکول، ہسپتال، ڈاک گھر وغیرہ سب انھیں کی دین ہے۔ ان کا جسم کمزور ہوا مگر فکر ہمیشہ توانا رہی۔ اور جسم سے ہار کے نتیجے میں 10 مئی 2002ء کو کیفی اپنے چاہنے والوں کو الوداع کہہ گئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. کیفی اعظمی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. کیفی کو لکھنؤ کے کس مدرسہ میں داخل کیا گیا؟
3. کیفی کے فلمی نغموں کے مجموعہ کا نام بتائیے۔

18.4 کیفی اعظمی کی شاعرانہ خصوصیات

کیفی اعظمی کی شاعری میں زندگی کے تجربوں کے ساتھ ساتھ اپنے حالات پر افسوس بھی ہے۔ وہ اپنے دور کے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کی مانگ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری بڑے بڑے تجربوں سے گزرتی ہوئی ان کے انفرادی و اجتماعی شعور کا نتیجہ ہے۔ یہ تجربے ان کے سماج کی دین ہیں جن سے چھن چھن کر ان کی شاعری باہر آئی ہے۔ ان کی شاعری میں خوبصورتی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ تلخی، کرب، مایوسی، شکست

اور ناکامی ہے۔ان کے یہاں رومانیت کی چاشنی ہے۔سیاست کی آنچ ہے۔اور انقلابی گھن گرج بھی۔کیفی اعظمی کی شاعری کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ان کی شاعری کا پہلا دور رومانیت کا ہے جس میں عشقیہ جذبات سے پُر نظمیں کہی گئیں۔دوسرا دور احتجاج، سیاست اور انقلاب کا ہے۔تو تیسرا دور عوام کے دروبست کا ہے۔

18.4.1 کیفی کی شاعری کا پہلا دور: رومانی شاعری

کیفی کی شاعری کا پہلا دور رومانی شاعری کا ہے۔کیفی کی عشقیہ و رومانی فکر صرف خیالی نہیں تھی وہ حقیقت تھی۔کیفی حقیقت میں ایک سچے اور جمال پسند انسان تھے ان کا جمالیاتی نقطۂ نظر محبوب کی زلف و رخسار ہی نہیں بلکہ اس کا وہ حسن ہے جو محبوب کی شخصیت سے جھلکتا ہے۔اور یہی حسن کیفی کی شاعری میں اجاگر ہے۔کیفی کے پہلے مجموعہ ''جھنکار'' کی نظمیں بانسری، شام، کہرے کا کھیت، معذرت، پہلا سلام، شباب، تصادم، منتیں وغیرہ کیفی کے رومانی مزاج کی ترجمانی کرتی ہیں۔کیفی کی اس دور کی شاعری بڑی نرم، مترنم اور نغمگی سے بھرپور ہے۔جذبے میں صداقت اور گرمجوشی ہے۔رومانی نظموں میں اتنی بے ساختگی، روانی اور شگفتگی ہے کہ پڑھنے والا کیف و سرور میں ڈوب جاتا ہے۔ کیفی کی شاعری کی نرمی اور شیرینی کا اندازہ درج ذیل مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزار جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

کیفی کی رومانی شاعری میں اثر پذیری کی وجہ ان کی زبان کی سادگی، جذبے کا خلوص، صداقت اور عشق کی پاکیزگی ہے۔کیفی کی رومانی نظمیں پڑھنے والوں کو اپنی زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ان کی رومانی نظم ''کسی کی آواز

سُن کر'' کیفی کے پاکیزہ عشق، معصوم جذبے اور رومان کی ایک اہم مثال ہے:

یا بج رہی ہوں جھٹپٹے میں مندروں کی گھنٹیاں
یا منھ اندھیرے دور سے آتی ہو آوازِ اذاں
یا بند کر دے جھینپ کر خلوت کی کوئی کھڑکیاں
اور بج رہی ہوں چوڑیاں
اے بنت مریم گنگنا
اے جانِ نغمہ گائے جا

18.4.2 کیفی کی شاعری کا دوسرا دور۔ احتجاجی، سیاسی اور انقلابی شاعری

کیفی کی شاعری کا دوسرا دور زمانے کی تلخی اور سماجی نابرابری کے خلاف غم وغصہ کا دور ہے۔ کیفی اعظمی نے سماج کا درد محسوس کیا۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے آواز بلند کی۔ انسانیت کے لئے لڑائی لڑی۔ اور اپنا حق حاصل کیا۔ اور اسی خیال کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ظلم، تشدّد، قدامت پرستی وتنگ نظری کے خلاف احتجاج ہے۔ انقلاب، بغاوت اور احتجاج ان کی شاعری میں خون بن کر دوڑتے ہیں۔ اور نعرہ بن کر سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف آگے بڑھتے ہیں۔ انھوں نے سیاسی لیڈران کو للکارا بھی ہے انھیں چیلنج کیا ہے اور اپنے ملک وقوم کے لوگوں کو بیدار کر کے محکم حوصلے کے ساتھ ان کی گندی سیاست کو خاک میں ملا دینے کی کوشش کی ہے۔ کیفی کی شاعری کے انھیں اوصاف نے انھیں ایک سیاسی، انقلابی واحتجاجی شاعر بنا دیا۔ اپنی ایک ایسی ہی نظم میں ظلم کا تختہ پلٹ دینے کے لیے اپنے کارواں کے ساتھ نکل پڑے ہیں۔ اب جتنی بھی آندھیاں آئیں طوفان آئیں وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ان کی یہ گرمجوشی ان کی نظم کو پُر وقار بناتی ہے:

بتادو قصر حکومت کے سب مکینوں کو
بچا سکیں تو بچالیں گے شہ نشینوں کو

ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستیں کے لئے
جلال میں وہ الٹ دیتے ہیں زمینوں کو
کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا

یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلادیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا
وہ کھیت کون اجاڑے گا، کون لوٹے گا
اُگی ہوئی ہیں منڈیروں پہ جن کی شمشیریں

کیفی اعظمی نے نہ صرف مردانہ سماج کی حس کو بیدار کیا بلکہ عورت کو بھی انقلابی جدوجہد میں مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا کر دیا۔ وہ عورت کے استحصال، اس کی عظمت وعزت کی پامالی کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے۔ اور اُسے اپنے حق کے لئے لڑنے کا حوصلہ بخشتے رہے۔ اپنی نظم عورت میں وہ عورت کو احتجاج کا علم پکڑاتے ہوئے کہتے ہیں:

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
قلب ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
جس میں جلتا ہوں اُسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفی کی احتجاجی شاعری میں وہ جس علم کو بلند کرتے ہیں وہ اشتراکیت کا سُرخ علم ہے۔ جو ترقی پسندوں نے

اٹھا رکھا ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اس احتجاج و انقلاب سے سیاست کی ناپاک چالیں خاک میں مل جائیں گی اور ظلم کے بادل چھٹ جائیں گے اور ضرور ایک نیا سویرا ہوگا۔ کیفی کی شاعری ادب اور رومان کی سبزہ زار پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی زندگی کے خارزاروں میں قدم رکھتی ہے اور پیادہ پا چلتی ہے۔

18.4.3 کیفی کی شاعری کا تیسرا دور۔ سماجی و عوامی شاعری

کیفی کی شاعری کے تیسرے دور کو ہم انسانی دردمندی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ کیفی کی شاعری کا اہم موضوع عوام ہیں۔ وہ عوام کی دھڑکن کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ عوام کے احساسات کو اپنے شعری لہجے میں ڈھالتے ہیں اور عوام کے غم و غصّے، درد، محرومی اور احساس کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ جو ان کی سماجی فکر کا حصہ ہیں۔ عوامی زندگی کی ساری ہلچل ان کے وجود میں اضطراب اور بیقراری بن کر اتر جاتی ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور ان کی بدحالی کو لے کر سوچتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور یہی فکر یہی درون بینی ان کی شاعری میں درد بن کر ابھرتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم ''مکان'' ہے۔ اس کے علاوہ نظم ''انتساب'' میں کیفی اپنے ملک کے غریبوں، محتاجوں اور افلاس زدہ مزدوروں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کا ایک بند پیش ہے:

بھوک نے پیاس نے، افلاس نے پالا ہے ہمیں
کبھی بہکے ہیں تو فاقوں نے سنبھالا ہے ہمیں
جھونپڑے پھونک کے میداں میں نکالا ہے ہمیں
آج ہر موڑ پر لکھیں گے کہانی اپنی
اپنی دھرتی میں سمو دیں گے جوانی اپنی

اس کے علاوہ ایک اور نظم میں قوم کی اور سماج کی بدحالی پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ اور اپنی بدحالی کا احساس عوام کو دلاتے ہیں:

یہ تمہاری تھکی تھکی بھیڑیں
رات جن کو زمیں کے سینے پر
صبح ہوتے انڈیل دیتی ہے
منڈیوں، دفتروں، ملوں کی طرف
ہانک دیتی، ڈھکیل دیتی ہے
راستے میں یہ رُک نہیں سکتیں
توڑ کے گھٹنے جھک نہیں سکتیں
ان سے تم کیا توقع رکھتے ہو
بھیڑیا ان کے ساتھ چلتا ہے

یہاں کیفی نے موجودہ نظام پر چوٹ کی ہے۔ یہاں بھیڑ سے بھیڑیا بننے کا استعارہ نظم کو معنویت بخشتا ہے۔ کیفی کی شاعری زندگی کی شاعری ہے۔ زندگی کی برہنہ سچائیوں کو پیش کرتی ہے۔ اور زمانے کو اپنے حق کے لئے لڑنے کی دعوت دیتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. کیفی اعظمی کی شاعری کے کتنے ادوار ہیں؟
5. کیفی کے پہلے مجموعہ کا نام بتایئے اور سنِ اشاعت لکھیے۔
6. کیفی کی کسی مشہور نظم کا نام لکھیے۔

18.5 نظم ''مکان'' کا متن

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی

سب اٹھو، میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں پہ اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

اپنی نس نس میں لیے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اس قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا رہا اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

18.6 تشریح

پہلا بند:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

سماجی پس منظر میں کہی گئی اس نظم میں کیفی اعظمی نے فٹ پاتھ پر رہنے والے مزدوروں کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس رات کا ذکر کیا ہے جب بہت تیز گرم ہوائیں چل رہی ہیں اور شاعر افسردہ ہے کہ انھیں یعنی غریبوں کو فٹ پاتھ پہ نیند نہیں آئے گی۔ وہ اشاروں میں کہنا چاہتا ہے کہ یہ ایک رات ہی کیا ایسی ہزار راتوں کو یہ جاگتے ہیں یعنی

لو کے تھپیڑوں سے جھلستی زندگی جب دن بھر کی محنت مشقت اور تھکن کے بعد رات کو فٹ پاتھ پر آرام کرنے کی غرض سے آتی ہے تو فٹ پاتھ کا فرش اتنا تپتا رہتا ہے کہ اس پر نیند آنا ممکن ہی نہیں۔ اور گرم ہواؤں کے تھپیڑے چہرے کو جھلساتے رہتے ہیں۔ یہ سب مصیبتیں اس لیے ہیں کہ ان کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہیں۔ نہ جانے کتنی حکومتیں آئیں سیاسی لیڈران آئے مگر وعدہ کرنے اور کامیاب ہونے کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ پھر پلٹ کر ان غریبوں کے حال پر نظر نہ ڈالی۔ شاعر اپنے ساتھیوں، ہم وطنوں کے دکھ درد میں شریک ہے۔ اسے شدید افسوس ہے کہ آج کی رات یہ دن بھر کے تھکے ہارے مزدور جن کی قسمت فٹ پاتھ کا جلتا جھلستا فرش ہے انھیں بھلا کس طرح اس پر نیند آئے گی۔ ایسے افسردہ ماحول میں شاعر اپنے ساتھیوں کو آس و اُمید دلاتا ہے کہ تم سب مل کر ایک ساتھ اٹھو۔ تم سب میری تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ ہم سب مل کر آواز اٹھائیں گے۔ نعرہ لگائیں گے۔ شاید ہماری آواز کسی سیاسی لیڈر تک پہنچ جائے، کچھ حد تک اس کی حِس بیدار ہو جائے اور وہ ہمارے لئے راحت کی کوئی کھڑکی کھول دے جس سے ہوا آسکے۔ شاید یہ سیاسی لوگ تمہاری تحریک، تمہاری آواز سے بیدار ہو جائیں اور تمہارے رہنے اور سونے کے لئے کسی ذاتی فرش کا انتظام کر دیں۔ تو یہ بڑا کام ہوگا۔

دوسرا بند:

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں پہ اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

کھڑکی علامت ہے روشنی کی، اُمید و بیم کی۔ جب زندگی ایسی مشکلوں سے گزر رہی ہو تب بھی اُمید کی روشنی انسان کو جینے پر، جدوجہد کرنے اور آگے بڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس بند میں کیفی اپنے ساتھیوں کو تاریخ کے ان لمحوں میں لے جانا چاہتے ہیں۔ جب انسان کے خواب و خیال میں مکان کا تصور بھی نہیں تھا۔ وہ صحرا بہ صحرا بھٹکتا تھا، پیڑوں پر،

جنگلوں میں، گپھاؤں میں رہتا تھا۔تب بھی ایسی ہی گرم ہوا چلتی تھی۔جب انسانوں نے پیڑوں پر رہنا چھوڑ کر زمین پر قدم رکھا تب بھی تپتی زمین تنور کی مانند لگی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ بس نگل ہی جائے گی۔اور آج بھی ایسا ہی حال ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ آج ہم ترقی کر چکے ہیں۔آج ہم سائنس، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور میڈیا کے دور میں پہنچ چکے ہیں۔ایسے ترقی یافتہ دور میں بھی جن کے پاس مکان نہیں وہ فٹ پاتھ پر جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

اس نظم میں کیفی نے ممبئی کی بھاگتی دوڑتی تیز گام زندگی کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان کے چند بڑے شہروں میں شامل ہے۔جو ملک کا بے حد ترقی یافتہ شہر ہے۔سائنس میڈیا اور گلیمر کا مرکز ہے۔ایسے شہر میں کچھ لوگ ہیں جو بڑی بڑی اونچی اونچی بلڈنگوں میں رہ رہے ہیں اور اسی شہر کا مزدور طبقہ فٹ پاتھ پر زندگی بسر کر رہا ہے۔شاعر تاریخ کے دریچوں سے ماضی کی گہرائیوں میں جھانکتا ہے اور بتاتا ہے کہ آج ہم اپنی تاریخ اپنا ماضی بھول چکے ہیں آج کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمیں نے یعنی حضرت انسان نے ہی گپھاؤں میں بھی زندگی گزاری ہے جہاں ہوا کا گزر بھی مشکل تھا۔ ہم نے ایسی جگہوں پر بھی زندگی بسر کی ہے۔شاعر کچھ دیر کے لئے فٹ پاتھ پر رہنے والے اپنے ساتھیوں کو تاریخ کا آئینہ دکھا کر بہلانا چاہتا ہے۔

تیسرا بند:

اپنی نس نس میں لیے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اس قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا رہا اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

نظم کے اس بند میں کیفی نے سماجی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے سیاسی لیڈران کی بے نیازی و بدعنوانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔انھیں افسوس ہے کہ یہ محنت کش جنھیں دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد دو روٹی نصیب ہوتی ہے یہ اپنی نس نس میں اپنے ایک ایک عضو میں مسلسل محنت کی تھکن لیے اسی اُمید پر بیٹھے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی کسی

مکان کے مالک ہوں گے۔ان کی بند آنکھوں میں یہی خواب ہے جو ہر روز آنکھ کھلنے پر ٹوٹ جاتا ہے۔ان کی اُمیدیں ان کے حسرت وارماں خاک میں مل چکے ہیں اور یہ امیدیں آج نہیں بندھائی گئی ہیں بلکہ برسوں کے وعدوں پر مرکوز ہیں جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ان مزدوروں کا دن اسی طرح دھوپ کی شدت کو برداشت کر کے محنت مزدوری کرتے ہوئے گزر جاتا ہے اور رات کو بھی انھیں سکون کی نیند میسر نہیں۔اس لئے کہ ان کی آنکھوں میں رات کالے تیر کی طرح چبھتی ہے کیونکہ انھیں سونے کو نہیں ملتا۔دن بھر کی تھکن اتارنے کو نہیں ملتا۔چونکہ رات بھی کالی ہوتی ہے اور تیر بھی۔تیر تو ویسے بھی زندگی کی روشنی کو بجھا دیتا ہے۔اندھیرا کر دیتا ہے۔اس لئے شاعر نے تیر کو رات کی سیاہی سے تشبیہ دی ہے۔

پوری نظم سماجی بدحالی اور سیاسی بدعنوانی کو خیال میں رکھ کر لکھی گئی جس میں مزدور زندگی کی نوحہ خوانی ہے، انسانی درد ہے، امیدیں ہیں، حسرتیں ہیں اور رات کی سیاہی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. کیفی اعظمی نے نظم ''مکان'' کہاں کہی تھی؟
8. کیفی کی یہ نظم کس نوعیت کی نظم ہے؟
9. کیفی کا مجموعہ ''آخر شب'' کب شائع ہوا؟

18.7 نظم کا خلاصہ

مذکورہ نظم میں شاعر فٹ پاتھ پر گزرنے والی غریبوں، مزدوروں کی زندگی پر روشنی ڈال رہا ہے۔وہ کہتا ہے کہ آج کی رات بہت گرم ہوا چل رہی ہے بھلا ایسی شدید گرمی اور لُو میں ان دن بھر کے تھکے ہارے غریبوں کو کس طرح نیند آئے گی جو محنت ومزدوری کے بعد آرام کرنا چاہتے ہیں انھیں رات کو بھی آرام میسر نہیں کیونکہ ان کے پاس مکان نہیں ہے۔اس لئے کیفی اپنے ساتھیوں کو نعرۂ احتجاج کی دعوت دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اٹھو اور میری آواز میں آواز ملا کر سیاسی بدعنوانی کے خلاف نعرے لگاؤ۔تا کہ شاید ان پر تمہاری آواز کا اثر ہو جائے اور وہ تمہیں

راحت پہنچانے کا خیال کرنے لگیں۔ یہ زمیں اس وقت بھی اتنی ہی تپ رہی ہے جتنی کہ پہلے تپتی تھی اس وقت جب ہم نے پیڑ پر رہنا شروع کیا آج کے لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ ہم یعنی انسان ہی گپھاؤں میں بھی رہ چکا ہے جبکہ وہاں ہوا کا ٹھنڈک کا کوئی گزر نہ تھا۔ ان کی نس نس میں محنت کی تھکن ہے اور آنکھوں میں مکان کا خواب ہے۔ ان کا دن اسی طرح تپتا، پگھلتا، بھاگ دوڑ کرتا اور جدوجہد کرتا گزرتا ہے اور رات جب سکون سے سونے کو نہیں ملتا تو نیند آنکھوں میں تیر کی طرح کھٹکتی ہے، چبھتی ہے۔ جس طرح تیر جسم کو چھیدتا ہے اسی طرح رات کو جب ان غریبوں کو گرمی اور لُو کے سبب سونے کو نہیں ملتا تو بے چینی بے قراری کی رات ان کی آنکھوں میں تیر بن کر چبھتی ہے۔ اور بے چین کیے رہتی ہے۔

18.8 اکائی کا خلاصہ

اطہر حسین کیفی 19 جنوری 1919ء کو ضلع اعظم گڑھ یوپی کے گاؤں مجواں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام فتح حسین اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ کیفی بچپن سے ہی حساس طبیعت کے انسان تھے۔ دوسرے کے دکھ درد سے جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ یہی دردمند دل اس شاعری کی بنیاد بنا جس میں انسانی زندگی کے کتنے ہی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ پہلا مجموعہ ''جھنکار'' دوسرا ''آخر شب'' اور تیسرا ''اوآخری آوارہ سجدے'' کے نام سے شائع ہوا۔ کیفی نے فلموں کے لیے بھی نغمے لکھے اور ان کی فلمی شاعری کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی اہم فلمیں ہیر رانجھا' حقیقت' نونہال اور ہنستے زخم وغیرہ ہیں۔ کیفی نے باوجود فالج کا شکار ہو جانے کے' ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری اور 10 مئی 2002ء کو ممبئی میں انتقال کیا۔

کیفی کی شاعری کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور رومانیت کا رہا۔ اس دور کی اہم نظمیں بانسری' شام' کہرے کا کھیت وغیرہ ہیں۔ دوسرا دور احتجاجی' سیاسی اور انقلابی شاعری کا ہے۔ ان کی مشہور نظم عورت اسی دور کی دین ہے۔ تیسرا دور سماجی وعوامی شاعری کا ہے۔ اس دور کی اہم ترین نظم ''مکان'' ہے جو شامل نصاب ہے اور جس کی تشریح اور خلاصہ پہلے کے صفحات میں موجود ہیں۔

نظم کا مقصد ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب دنیا نئے نئے تجربات اور تعمیرات سے گزر رہی ہے سیاست دانوں کے ہزاروں وعدوں اور دعوؤں کے باوجود لاکھوں کروڑوں لوگ بے گھر ہیں۔ وہ فٹ پاتھ پر اور جھگی جھونپڑیوں میں حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہیں۔ ہمیں ان کے متعلق سوچنا ہے کہ انسان اور کائنات کے بارے میں انسان ہی سوچتا آیا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔

18.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. کیفی کی شاعری کے تیسرے دور کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
2. نظم ''مکان'' کے پہلے بند کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. کیفی اعظمی کے حالات زندگی اور اُن کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔
2. کیفی کی شاعرانہ خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
3. کیفی کا تعارف کراتے ہوئے اُن کی نظم ''مکان'' کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

18.10 فرہنگ

شاخوں	ٹہنیوں
مکینوں	مکان میں رہنے والوں
گپھا	غار
پیہم	لگاتار، مسلسل
قصر	محل
سیہ	کالا

18.11 معاون کتابیں

1. ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری : ڈاکٹر یعقوب یاور
2. کیفیات : (کلیات) کیفی اعظمی
3. تین ترقی پسند شاعر : پروفیسر علی احمد فاطمی
4. کیفی اعظمی عکس اور جہت : شاہد ماہلی

18.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. کیفی اعظمی کی پیدائش 19 جنوری 1919ء کو مجواں اعظم گڑھ میں ہوئی۔
2. مدرسہ سلطان المدارس میں داخل کیا گیا۔
3. ''میری آواز سنو''
4. کیفی کی شاعری کے تین دور ہیں۔
5. کیفی کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' ہے جو 1943ء میں شائع ہوا۔
6. کیفی کی مشہور نظم ''عورت'' ہے۔
7. کیفی نے نظم ''مکان'' مدن پورہ ممبئی کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کہی تھی۔
8. کیفی کی یہ نظم سماجی وسیاسی نوعیت کی ہے۔
9. کیفی کا مجموعہ ''آخر شب'' 1947ء میں شائع ہوا۔